ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ

پانچویں کتاب

مئی ۲۰۰۳ء

مراسلت: c/۵۴۵ گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey@poetic.com

مطبع: حافظ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: بیس روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

لہولہو عراق:

۲۔ اضطراب ہائے جنگ — نوم چامسکی/احمد ندیم تونسوی — ۵
۳۔ عراق کو تاریخ سے محروم کرنے کی سازش — ڈاکٹر مبارک علی/ندیم اقبال پاشا — ۸
۴۔ برہنہ سامراجیت — کرامت اللہ کے۔غوری/نیر عباس زیدی — ۱۱
۵۔ قیامت (افسانہ) — ڈاکٹر قاضی عابد — ۱۶
۶۔ عراق کی بربادی پر ایک نوحہ (نظم) — پروفیسر اصغر علی شاہ — ۱۹
۷۔ دوسرا محاذ (نظم) — پروفیسر شریف اشرف — ۲۱
۸۔ جہانِ نو کے یہ خود ساختہ آقا (نظم) — ڈاکٹر علی اطہر — ۲۲
۹۔ چشمِ تر سے نظارہ (نظم) — نوشی انجم — ۲۴

مکالمہ:

۷۔ زوار حسین سے ایک مکالمہ — ڈاکٹر نعمت الحق، شوکت نعیم قادری — ۲۵

مضامین:

۹۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید نگاری پر چند خیالات — ناصر عباس نیر — ۲۲
۱۰۔ چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں کی علمی و ادبی۔۔۔ — ڈاکٹر عصمت ناز — ۴۰
۱۱۔ ملتان کے حوالے سے ایک اُردو تلمیح — شوکت نعیم قادری — ۵۲

کہانی:

۱۲۔ محبت کا ایک دور — موپساں/لیاقت رضا جعفری — ۵۵

کتابوں پر تبصرہ:

۱۳۔ کتابوں پر تبصرہ — ڈاکٹر شگفتہ حسین — ۶۱

شاعری:

۱۴۔ دس غزلیں — غلام حسین ساجد — ۷۱

حروفِ زر:

۱۵۔ قارئین کے خطوط — ۷۷

نوم چامسکی

ترجمہ: احمد ندیم تونسوی

اضطراب ہائے جنگ

اس لمحۂ خوف میں، ہم جاری جنگ کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اُن لوگوں کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں جو انصاف، آزادی اور انسانی حقوق سے ذرا سا بھی تعلق رکھتے ہیں۔ حملے کا کچھ بھی نتیجہ نکلے، کام پہلے سے زیادہ محنت طلب اور فوری ہوگا۔

اس کے لیے پینٹا گون، سی آئی اے سمیت کسی کے پاس کوئی خاکہ نہیں۔ خوفناک انسانی تباہی، جس کے بارے میں عراق میں کام کرنے والے انسانی امداد اور بحالی کے ادارے متنبہ کرتے آئے ہیں، سے لے کر مقابلتاً کم خوفناک نتائج تک کے امکانات موجود ہیں۔ اگرچہ کسی کا بال برابر بھی نقصان نہیں ہوتا تب بھی یہ حملہ اُن لوگوں کے جرائم کو کم نہیں کر سکتا جو اپنے شرم ناک مقاصد کے حصول کے لیے بے یار و مددگار انسانوں کو اپنی دہشت کا ہدف بنانے کے متمنی ہیں۔

حملے کے نتائج کے ضمن میں کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا مگر ایک فوری کام یہ ہے کہ ان نتائج کی ہولناکیت کو کم کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی طور پر نہ صرف اس حملے سے متاثرہ ستم رسیدہ لوگوں کی بحالی کی طرف توجہ دی جائے بلکہ واشنگٹن کے گزشتہ دس سالہ شیطانی اور تخریبی پابندیوں کے عہد، جس نے سویلین سوسائٹی کو برباد، آمر حکمرانوں کو مضبوط اور انسانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی بقا کے لیے امریکہ پر انحصار کریں، کا نشانہ بننے والے لوگوں کی بہبود کی طرف توجہ دی جائے۔

جیسا کہ کئی سالوں سے کہا جا رہا ہے کہ پابندیاں اس اُمید پر لگائی گئی ہیں کہ صدام کو بھی اُسی طرح اقتدار سے ہٹا دیا جائے گا جس طرح دوسرے آمر جو اس سے کسی طرح کم ظالم نہ تھے، اقتدار سے ہٹا دیئے گئے۔ اس شیطانی گیلری میں اُن تمام آمروں کا گروہ شامل ہے جن کو واشنگٹن کے صاحب اقتدار ٹولے کی مدد حاصل رہی ہے اور کئی ایک آمروں کے معاملے میں تو یہ مدد اُن کے آخری دنوں تک شامل رہی۔

اس حملے کا نتیجہ بھاری اکثریت میں غیر ملکیوں کا امریکہ چھوڑنا ابتدائی شائستگی کا مظاہرہ ہو سکتا ہے اور اگر یہ نہ بھی ہو تب بھی عراقی عوام کے لیے امداد کی کمی سے مسائل اور گھمبیر ہو گئے ہیں جس کا وعدہ واشنگٹن والوں نے اور خاص طور پر کرافورڈ نے کیا ہے جس کا ایمان ہے کہ طاقت کا سرچشمہ بندوق کی نالی ہے۔

لیکن مسائل ان سے کہیں زیادہ بنیادی اور طویل مدتی ہیں۔ امریکی حملے کی مکمل طور پر مخالفت کی مثال اس سے پہلے تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے بُش نے اپنے دو پرانے دوستوں سے ایک جزیرے پر امریکی فوجی اڈے پر ملاقات نہیں کی۔ یہ مخالفت عراق پر حملے کا مرکز ہو سکتی ہے مگر اس مخالفت کے اثرات اس سے کہیں زیادہ دُوررَس ہو سکتے ہیں۔ امریکہ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ایک بھاری اکثریت خوف زدہ ہے اور اس کی یہ بڑھتی ہوئی طاقت دُنیا کے ایک بڑے حصے میں امن کے لیے خطرہ ہے۔ تباہ کن ٹیکنالوجی، جو کہ تیزی سے مہلک سے مہلک تر ہوتی جا رہی ہے، کی موجودگی میں امن تو ایک طرف اب بنی نوع انسان کی بقا کو خطرہ لاحق ہے۔

امریکی حکومت کا ڈر محض اِس حملے پر استوار نہیں بلکہ اُس پس منظر پر مبنی ہے جہاں سے یہ ڈر اُبھرا ہے۔ دُنیا پر طاقت سے حکمرانی کا کھلم کھلا اعلان جو کہ امریکی حکومت کا خاصہ ہے اور بات کو یقینی بنانا کہ اُس کی برتری کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ ''احتیاطی جنگ'' مجبوری کے تحت لڑی جاتی ہے۔ اِس کے پیچھے کوئی خواہش کارفرما نہیں ہوتی۔ ''پیشگی جنگ'' کا کچھ بھی جواز رہا ہو یہ بعض اوقات تخیلاتی اور تصوراتی خطرے کو مٹانے کے لیے فوجی طاقت کا استعمال ہوتا ہے اور یہ ''احتیاطی جنگ'' سے قطعاً مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ ''امریکی طاقت، برتری اور وقار کو درپیش کسی بھی چیلنج کو روکنا ہی دراصل کھلم کھلا اعلان کردہ مقصد ہے۔''

اب یا مستقبل میں ایسے چیلنج یا ظاہر ہونے والی ایسی کسی علامت کا بغیر کسی بھرپور طاقت کے استعمال کے امریکہ کے حکمرانوں کے لیے مقابلہ ممکن ہو سکے، جس نے اکیلے ہی فوجی طاقت کے اضافے میں باقی ساری دنیا کو پچھاڑ دیا ہے اور تقریباً یک آواز دنیا کی مخالفت کی پروا، نہ کرتے ہوئے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو مہلک سے مہلک بنا رہا ہے۔ خلا میں مہلک ہتھیاروں کو جدید ترین بنانا محض ایک مثال ہے۔

یہ یاد رہے کہ یہ الفاظ ڈونلڈ رمزفلڈ یا ڈک چینی یا واشنگٹن کے ایوان اقتدار میں بیٹھے ہوئے کسی اور بنیاد پرست کے نہیں، بلکہ یہ الفاظ چالیس سال پہلے کینیڈی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیدار ڈین ایچسن کے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ بین الاقوامی دہشت گرد مہم برائے ''تبدیلیٔ عہد'' دُنیا کو ایٹمی جنگ کے قریب لے آئی ہے، وہ کیوبا پر امریکی حملے کا قانونی جواز پیش کر رہا تھا۔

اس یادداشت کی بازیافت کا میرا مقصد یہ ہے کہ مسائل کی جڑیں عمیق سے عمیق تر ہیں۔ واشنگٹن کی موجود انتظامیہ حکمت عملی کی منصوبہ سازی کے انتہائی سرے پر ہے اور اس کی مہم جوئی اور تشدد پسندی غیر معمولی طور پر خطرناک ہے۔

تکلف برطرف، بشمول اپنے ملک کے صاحب الرائے لوگوں کی اکثریت کے، طاقت کے پجاریوں نے ساری دنیا پہ کپکپی طاری کر دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روایتی ستم رسیدوں کے ہاں ردِعمل غیر معمولی خوف کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تاریخ کو ہمیشہ ملمع زدہ لفاظی سے ہی قبول عام بنایا جاتا رہا ہے۔ وہ اس بارے کافی سُن چکے ہیں کہ اُنہیں ''تہذیب'' نامی ڈنڈے سے صدیوں سے مارا جا رہا ہے۔ محض چند دِن پہلے غیر جانبدار تحریک، جس میں دُنیا کی زیادہ آبادی والی حکومتیں شامل ہیں، کے صدر نشین نے بُش انتظامیہ کو ہٹلر سے زیادہ ظالمانہ قرار دیا ہے۔ موصوف امریکہ کے حامی اور واشنگٹن کے بین الاقوامی معیشتی منصوبوں میں نہایت اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ اس میں شک کی کم ہی گنجائش ہے کہ وہ بہت سے روایتی ستم رسیدوں کے لیے بول رہا تھا۔

حتیٰ کہ اِس سے پہلے کہ بُش انتظامیہ، حالیہ مہینوں میں خوف و ہراس کی رفتار کو تیز کرتی، انٹیلیجنس اور بین الاقوامی امور کے ماہرین ان معاملات میں دلچسپی لینے والوں کو مطلع کرتے رہے ہیں کہ امریکہ محض انتقام اور سزا دینے کی نیت سے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تیاری کر رہا ہے۔

اپنی کارروائیوں اور اعلانات کے سبب پیدا ہونے والے خوف و ہراس کے ردِعمل کے جواب کے ضمن میں امریکہ کے پاس دو راستے ہیں۔ بڑھتے ہوئے اِس خوف کو کم کرنے کا پہلا راستہ تو جائز رنجیدگی اور شکایات کی طرف توجہ دینا اور دُنیا اور عالمی اداروں کے لیے کچھ نہ کچھ احترام کے ساتھ عالمی برادری کا ایک مہذب

رکن بننے کا عہد ہے۔ دوسرا راستہ تخریب وتسلط کے جدید ترین ہتھیاروں کی تخلیق ہے تا کہ خود اپنے ہی اشتعال دلانے سے پیدا ہونے والے خطرات، چاہے یہ خطرات کتنے ہی دُور از کار ہی کیوں نہ ہوں، کو کچلا جا سکے۔

راہِ ثانی کے سبب خود ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لوگوں اور باقی دنیا کو یقینی خطرہ لاحق ہے، اور کسی حد تک یہ ممکن ہے کہ نسلِ انسانی ہی معدوم ہو جائے اور یہ کوئی ایسا بے بنیاد قیاس بھی نہیں۔

اٰیچسن کی تقریر سے چند ماہ پہلے ایٹمی جنگ کا ٹل جانا ماضی کا ایک معجزہ ہی ہے۔ جس کو یادداشت میں آج بھی تازہ رکھا جانا چاہیے۔ خطرات آج بھی شدید اور کہیں زیادہ ہیں۔ واشنگٹن میں جاری سرگرمیوں کو خوف اور اضطراب سے دیکھنے کے لیے دنیا کے پاس جواز ہے۔ جو لوگ اِس بڑھتے ہوئے خوف سے نجات دلا سکتے ہیں اور پُر امید اور تعمیری مستقبل کی طرف راہنمائی کر سکتے ہیں وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شہری ہیں۔ یہ مستقبل کو ایک خوشگوار شکل میں ڈھال سکتے ہیں۔

میرے خیال میں یہ ہیں وہ متعلقات جنگ جن کو واضح طور پر دماغ میں رکھا جانا چاہیے۔ انسانی تاریخ کی خوفناک ترین فوجی طاقت ایک ناقابل دفاع دشمن کے خلاف مانندِ سگِ آزاد برسرِ پیکار ہے اور جو گزشتہ دو عشروں سے انسانی تاریخ کو ہیبت اور وحشت سے مرتب کر رہی ہے۔

✲ ✲ ✲

ڈاکٹر مبارک علی ترجمہ: ندیم اقبال پاشا

عراق کو تاریخ سے محروم کرنے کی سازش

یہ تاریخ کا عمومی مظہر ہے کہ سامراجی طاقتیں اپنے مخالفین پر عسکری غلبہ پانے کے بعد انہیں تاریخی وثقافتی ورثے سے محروم کرنے کی منظّم کوششیں کرتی ہیں اور اس طرح انہیں دانش اور ثقافت کے لحاظ سے کم تر بنا دیتی ہیں۔ فاتح قوت مفتوحین کی شناخت ختم کر کے اُن کی زباں بندی اور پابندیوں سے اُن کی قوت مزاحمت کو ختم کر دیتی ہے۔ مزید براں یہ عمل شکست خوردہ قوم کے سامراجی ثقافت میں انجذاب کو آسان بنا دیتا ہے اور اس طرح وہ آسانی سے فاتح قوتوں کے غلام بنائے جا سکتے ہیں۔

جنوبی امریکہ میں ایسا ہی ہوا جہاں ''انکا، مایا اور ایزٹیک'' تہذیبوں، اُن کی تاریخی یادگاروں اور فن پاروں کو لوٹ کر برباد کر دیا گیا۔ مقامی باشندوں کو اُن کے ماضی سے بے تعلق کرنے کے بعد انہیں سامراجی ہسپانوی نظام کا جزو بنا دیا گیا۔ بالکل یہی عمل شمالی امریکہ اور آسٹریلیا میں برتا گیا جہاں مقامی باشندوں کو غالب یورپی ثقافت کی کٹھالی میں جذب کرنے سے پہلے انہیں اپنی ثقافتی جڑوں کو کاٹنے، بھولنے اور چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔

دوسری مثال میں قابض قوتوں نے اُن کے تاریخی آثار قدیمہ، مخطوطات اور مقبوضہ قوم کی اہم دستاویزات کو لوٹ کر اپنے ملک کے عجائب خانوں اور کتب خانوں میں جمع کرا دیا تا کہ مفتوح قوموں کی تاریخ اور دانش کو سامراجی قوتوں کے تابع رکھا جا سکے۔ وسائل اور اختیار کا مالک ہونے کی بنا پر انہوں نے نو آبادیاتی ملکوں کی تاریخ کو اپنے مفادات کے مطابق توڑ مروڑ کر، ڈھال کر، توضیح کر کے پیش کیا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کی نو آبادکار طاقتوں نے ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کو اُن کے تاریخی ورثے سے محروم کرنے کے لیے یہی نمونہ اپنایا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو اُس نے مصری یادگاروں سے لدے ہوئے بحری جہاز فرانس روانہ کیے۔ یہ یادگاریں اب لورے میوزیم (Louvre Museum) میں موجود ہیں۔ برٹش میوزیم بھی ایسی ہی ایک مثال ہے جو برطانوی نو آبادیوں سے لُوٹے گئے تاریخی نوادرات اور فن پاروں کا گودام ہے۔

اِس عمل کی تیسری مثال میں جو کہ امریکیوں نے پیش کی ہے قیمتی نوادرات اور مخطوطات کو چرا کر اپنے عجائب خانوں اور کتب خانوں کو بیچنے کے عمل کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نجی طور پر تاریخی نوادرات جمع کرنے والوں کے لیے تاریخی اہمیت کی حامل اشیاء کا بھاری قیمت پر حصول اور غیر قانونی تجارت انتہائی پُر کشش کاروبار بن چکا ہے۔ اس کی ایک مثال افغانستان ہے۔ افغان میوزیم میں مجرم تنظیموں نے لوٹ مار کی اور اس کے نوادرات اب عالمی منڈیوں میں فروخت ہو رہے ہیں۔

ایسی مثالوں کی پیروی کرتے ہوئے امریکی اب عراقی عوام کو بے اختیار، تاریخ سے عاری اور اپنے ثقافتی ماضی کے کسی بھی احساس سے محروم کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ دنیا بھر میں عراق

کو ''تہذیب کا گہوارہ'' کہا جاتا ہے۔ یہاں پر اُر، نینوا اور بابل جیسے عظیم شہروں کے ساتھ ساتھ سمیری، اسیری، اکادی اور بابلی تہذیبوں نے جنم لیا۔ یہ پہلی تہذیب تھی جس نے میخی رسم الخط، علم ریاضی میں اعشاری نظام اور قمری تقویم متعارف کروائے۔ عراقی اپنے ماضی پر فخر کرتے ہیں۔ وہ خود کو قدیم ترین تہذیب کا وارث اور انسانیت کا محسن سمجھتے ہیں۔

امریکی اب اُن کے فخر اور تاریخی شعور کو سلب کرنے اور اُن کے تشخص کو معدوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ سامراجی قوتوں نے انہیں عسکری شکست ضرور دی ہے مگر ثقافتی لحاظ سے نہیں۔

امریکہ کا مسئلہ یہ ہے کہ اُس نے بحیثیت قوم دنیا بھر پر سائنسی اور تکنیکی برتری حاصل کر لی ہے۔ یہ عسکری اور معاشی لحاظ سے بڑی طاقت ہے لیکن اس کا کوئی ماضی نہیں ہے اور نہ ہی یہ شاندار تاریخی ورثے کی حامل ہے۔ یہ جب ایشیائی اور افریقی قدیم اقوام سے خود کا تقابل کرتی ہے تو تاریخی روایات اور اداروں کی عدم موجودگی کی بنا پر خود کو بہت چھوٹا اور غیر اہم قوم پاتی ہے۔ اس کمزوری سے چھٹکارا پانے کے لیے امریکی کسی بھی جائز یا ناجائز ذرائع سے اہم تاریخی نوادرات اور مخطوطات کو اپنے اداروں سے جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیکن اس طرح سے وہ اشیاء جمع کرنے والے تو بن سکتے ہیں لیکن ماضی کی تہذیبوں کے حقیقی وارث نہیں بن سکتے۔ عراق میں بظاہر اُن کا بڑا مقصد عراقیوں کے تاریخی نوادرات پر قابض ہونا اور انہیں تباہ کرنا نہیں لگتا اگرچہ عجائب خانوں اور کتب خانوں پر ہجوم کی لوٹ مار کی خبروں سے ابتدائی تاثر یہی بنتا تھا لیکن درحقیقت لوٹ مار کرنے والے یہ گروہ قیمتی نوادرات کو لے جا کر نجی شائقین نوادرات کو فروخت کرنے کی خود اختیاری خواہش کے تحت منظّم ہیں۔ برطانوی ماہرین آثار قدیمہ کے ایک گروہ کے مطابق انہوں نے پینٹاگون سے اُس قانون میں لچک پیدا کرنے پر زور دیا ہے جس کے تحت عراقی آثار قدیمہ کی دیگر ممالک میں فروخت کو روکنے کے لیے تحفظ دیا گیا ہے۔

ایک اور رپورٹ کے مطابق ثقافتی پالیسی کی امریکن کونسل (The American Council for Cultural Policy)، نادر اشیاء جمع کرنے والے اور اُن کی تجارت کرنے والے ساٹھ افراد کا ایک اتحاد (قابض قوتوں کے اتحاد جیسا) نے بُش انتظامیہ سے ملاقات کر کے دلائل دیئے کہ صدام کے بعد عراق میں آثار قدیمہ کے قوانین میں لچک پیدا کی جائے۔ اب ایسی مصدقہ رپورٹیں آچکی ہیں جن کے مطابق لوٹ مار کرنے والے گروہوں کی پشت پر ایک منظّم مافیا کام کر رہا ہے جو انتشار اور بدنظمی کا فائدہ اُٹھا کر عراق کے تاریخی خزانوں کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ یہ تمام سرگرمیاں سامراجی اور قابض قوتوں کے طفیل ہیں۔

حال ہی میں بغداد کے کتب خانے کے نذرِ آتش ہونے کا واقعہ، جس میں قیمتی مخطوطات اور دستاویزات مکمل طور پر تباہ ہوگئیں، قابض قوتوں کی پالیسی کی تصدیق کرتا ہے جس کے مطابق وہ عراقی عوام کو اُن کی تاریخ اور ماضی سے محروم کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ جلی ہوئی دستاویزات، مخطوطات اور نادر کتب کی تفصیل بتانے کے بعد رابرٹ فسک سوال کرتا ہے کیوں؟ اِس ''کیوں'' کا جواب امریکی نفسیات میں پوشیدہ ہے۔ ۱۹۹۱ء کی پہلی خلیجی جنگ میں جارج بُش سینئر نے کویت پر عراقی چڑھائی کی مذمت کرتے ہوئے کہا: ''تمام مہذب دنیا عراق کی مخالف ہے''۔ ۱۱ ستمبر کے بعد اُس کے بیٹے بُش جونیئر نے دہراتے ہوئے اعلان کیا کہ اُس کا مقصد تہذیب کو بچانا

اور اُس کا تحفظ کرنا ہے۔ اُس نے موجودہ تنازعے کو مہذب دنیا یعنی امریکہ اور دہشت گردوں جو کہ مشرق وسطیٰ کے لوگ ہیں، کا جھگڑا قرار دیا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مغرب اپنی تہذیب کو بچانے اور محفوظ کرنے کے لیے دیگر تمام تہذیبوں اور ثقافتوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا چاہے گا۔ دیگر اقوام، خصوصاً وہ اقوام جو امریکی استعمار کے خلاف مزاحم ہوں، کو اُن کی تاریخ اور ماضی سے محروم کر کے انہیں خاموش کرنے کے بعد قدیم وحشی دور میں دھکیل دے گا۔

امریکی قابض افواج عراقی عوام کو اُن کے ثقافتی ورثے سے محروم کر کے ایک ایسا ماڈل تخلیق کرنے کی کوشش کر رہی ہیں جس میں یہ عوام شیعہ، سنی اور کرد گروہوں میں اس طرح تقسیم ہو جائیں کہ آپس کی انتہائی دشمنی کی وجہ سے انہیں امن قائم رکھنے کے لیے ایک متوازن قوت کی ضرورت ہو۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ لوگ اپنی تاریخ، ثقافت اور تشخص کھو بیٹھیں تو انہیں قابض اقوام اپنی منشاء کے مطابق کسی بھی سانچے میں ڈھال سکتی ہیں۔ لہٰذا عراقی عوام اگر ایک بار بھی اپنے تاریخی وسائل سے محروم ہو گئے تو پھر اُن کے لیے اپنی تاریخ کی تعمیر نو اور تشکیل نو ناممکن ہو جائے گی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جو اپنے ماضی پر گرفت رکھتے ہیں اپنے مستقبل پر بھی گرفت رکھتے ہیں۔ یہی وہ سب کچھ ہے جو امریکی عراق میں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

❋ ❋ ❋

کرامت اللہ کے۔غوری ترجمہ: نیر عباس زیدی

برہنہ سامراجیت

واشنگٹن کے عراق پر وحشیانہ حملے کے منصوبہ ساز امید رکھتے تھے کہ وہ اپنے عراقی شکاروں کے دلوں میں خوف و دہشت کی سی کیفیت پیدا کر دیں گے۔ اس کی بجائے وہ نہ صرف عراقیوں بلکہ تہذیب یافتہ دنیا کی اکثریت کے دلوں میں نفرت و آزردگی کے جذبات ہی پیدا کر سکے ہیں۔ منطقی دنیا سے تعلق رکھنے والے چند افراد، جو امریکی میڈیا کی شل کر دینے والی یلغار سے باہر ہیں، اس بات پر تیار ہیں کہ وہ امریکی پروپیگنڈہ کی بھنبھناہٹ میں اس لفظ کو یکسر ڈھیر کر دیں کہ عراق میں امریکہ محکوم عوام کے ''نجات دہندہ'' کی حیثیت سے آیا ہے نہ کہ اُس علاقے کے فاتح کی حیثیت سے جو عرصہ دراز سے اس کی نظروں میں تھا۔ ایک طویل عرصے بعد دنیا نے پھر دیکھا۔ مارچ ۱۹۱۷ء آج سے پورے چھیاسی سال قبل۔ جب عراق کے ایک اور شاہی حملہ آور نے خود کو عراق کا ''نجات دہندہ'' کہلوایا۔ یہ برطانوی فوج کا جنرل سر فریڈرک ٹینسلے موڈ (SirFredricktanleyMaude) تھا جو فاتح فوج کے سربراہ کی حیثیت سے بغداد میں داخل ہوا۔ جس نے اس سے کچھ عرصہ قبل ہی عثمانی ترکوں کی گت بنائی تھی، وہ بغداد کے لوگوں سے ان الفاظ میں وعظ فرمانے لگا۔ ''ہماری فوج تمہارے شہروں میں اور علاقے میں فاتح یا دشمن کی حیثیت سے نہیں آئی بلکہ آزادی دلانے آئی ہے۔ اس باوقار منادی کے بعد عراق کے برطانوی ''نجات دہندہ'' اس سرزمین پر طویل بیس سال تک قیام پذیر رہے اور انہوں نے عراقیوں کو بلا جواز زیر کرنے اور مطیع بنانے کے لیے تمام ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے۔ آخر میں انہوں نے اپنا غاصبانہ قبضہ محض اس لیے ختم کر دیا کہ عراقیوں نے اس قبضہ کی ''قیمت'' اس درجہ بڑھا دی کہ وہ ان کی برداشت سے باہر تھی۔

جارج ڈبلیو بش اور اس کے نئے چکمہ میں آنے والے اور بار دیگر پیدا ہونے والے عیسائی بنیاد پرستوں کا ہم خیال ٹولہ اُسی زبان اور نحو کی پیروی کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو برطانوی سامراجی نوآبادکار قوتوں نے اپنی عالمی قوت کے نقطۂ عروج کے دنوں میں استعمال کی لیکن ان کی زبانی بازی گری اور جادوگری کا اثر ایسا ہی ہوا جیسے آسمانی برف کے ذروں کا تپتی ہوئی زمین پر۔ وہ خود فریبی کے بہت سے چکروں سے گزرے۔ معائنہ کاری سے تخفیفِ اسلحہ اور پھر حکومت کی تبدیلی تک۔ دنیا صرف ان کے سطحی اور ظاہری چہرے ہی دیکھ سکی ہے۔ ابتدا سے انتہاء تک صرف اصلی محرک اور مقصد، عراق پر اس کے وسیع تیل کے ذخائر کی وجہ سے قبضہ جمانا اور اسے دنیا کے انتہائی حساس اور جنگی حکمتِ عملی کے حوالے سے اہم حصوں کے لیے اڈے کے طور پر استعمال کرنا ہے جو کوئی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ عراق پر قبضے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اسے توسیع پسندی کے حوالے سے امریکہ کی گزشتہ ۱۵۰ سالہ تاریخ پر تنقیدی نظر ڈالنی چاہیے تاکہ وہ اس اہم مسئلہ کے وسیع تناظر میں جا سکے۔ انتہائی سرعت سے چلنے والی شہنشاہی لہر امریکی نفسیات یا حکومتی پالیسی کے لیے نئی نہیں۔ یہ تب شروع ہوئی جب امریکیوں نے برطانوی نوآبادیاتی بھوت کو بھسم کیا جس کے پس منظر میں ۱۸۱۲ء میں برطانوی فوج کا واشنگٹن پر وہ شرمندۂ تکمیل حملہ تھا جس میں انہوں نے وائٹ ہاؤس کو نذرِ آتش کیا۔ یہ صدر جیمز مونرو تھا جس نے ۱۸۲۸ء میں اعلان کیا کہ

بحرِ اوقیانوس کا وہ حصہ جو جزائر غرب الہند اور وسطی امریکہ کے درمیان واقع ہے اور اسی کے محیط کو امریکہ کی بند کھاڑی قرار دے کر کسی جارحانہ قوت کے مقابلے میں اس کے دفاع کیے جانے کو ترغیب دی۔ میز و دستاویزات نے بحرِ اوقیانوس اور وسطی امریکہ میں واشنگٹن کے سامراجی عزائم کو بے نقاب کیا، امریکی جنگی حکمتِ عملی اور معاشی اہمیت کے حامل امریکی توسیع پسندانہ عزائم کا دروازہ کھولا۔ اس چیز نے جلد ہی امریکہ کو میکسیکو کے ساتھ جنگوں میں مصروف کر دیا، یہ اس وقت سپین کی ایک بڑی نوآبادی تھی، اور خود خطے میں ایک غیر معمولی نوآبادیاتی قوت تھی جہاں امریکی دعوے مونرو سے بدلے ہوئے تھے۔ ٹیکساس، نیواڈا (Nevada)، ایریزونیا اور جنوبی کیلی فورنیا کی ریاستیں میکسیکو سے جنگی لوٹ کے مال کی حیثیت سے چھین لی گئیں۔ امریکی خانہ جنگی نے واشنگٹن کے علاقائی توسیع پسندانہ عزائم میں کچھ عارضی رخنہ ڈالا لیکن اس کے ختم ہونے کے بعد ۱۸۹۰ء کی امریکہ سپین جنگ نے اس عزم میں نیا بلہ بول دیا جس نے امریکہ کے علاقائی اور زمینی ذخائر میں، سپین کو مغلوب کرنے کے بعد اضافہ کیا۔ ''پیورٹو ریکو'' ایک جنگی ٹرافی تھی جو ایک صدی گزرنے کے بعد بھی امریکہ کی ''دولت مشترکہ'' ہے۔ کیوبا کی حیثیت بھی امریکہ کی ایک نوآبادی کی سی ہوگئی جو ایک بگڑے فاسد حکمران طبقہ کے ساتھ امریکہ کے ہاتھ لگی۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۹ء کے فیدرل کاسترو کے کامیاب انقلاب تک رہا کہ جس نے کیوبا کے بوسیدہ نظام اور ناپسندیدہ افراد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور وہاں کے باشندوں نے امریکی تسلط سے آزادی اور خودداری حاصل کی۔ فلپائن جو سات ہزار جزائر پر مشتمل ہے کے لیے جنگ کی گئی، جیسا کہ حال ہی میں عراق کے لیے۔ یہ جنگ بھی فلپائن کو ہسپانیہ سے ''آزاد'' کرانے کے نام پر کی گئی لیکن جونہی ہسپانیہ کو شکست کے بعد وہاں سے نکالا گیا واشنگٹن نے چینی اور تمبا کو سے مالا مال ان جزائر پر ایک نوآبادی کی حیثیت سے قبضہ جما لیا اور یہ ۱۹۴۵ء کی جنگ عظیم دوئم کے اختتام تک امریکہ کے زیر اثر رہا۔

ولسن کی آزاد پسندی جو جنگ عظیم اول سے قبل کے عرصے میں شروع ہوئی وہ شہنشاہی رویہ کا تریاق سمجھی جاتی تھی۔ تاہم اس کا دورانیہ کم تھا اور یہ جنگ کے اختتام پر ہی کملا گئی۔ یک وتنہا شہنشاہیت کی طرف سے ردعمل انتہائی شدید تھا کہ امریکی سینٹ نے یہ منظر دیکھا کہ ووڈرو ولسن کا دیرینہ خواب تیزی سے تعبیر کی طرف بڑھا کہ لیگ آف نیشن کا ایک سرکردہ شریک بنا جائے جو اسی کی ذہن کی اختراع تھی۔

جارج بش کے ہم خیال ٹولے نے جس عداوت کا مظاہرہ اقوام متحدہ کے ساتھ کیا یہ اُسی ۱۹۲۰ء کی دہائی کی پرانی اور روایتی ذہنیت کی عکاس ہے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے معاشی بحران نے شہنشاہی آتشِ شوق کو کچھ سست کر دیا مگر جلد ہی جنگ عظیم دوئم نے اسے بامِ عروج بخشا۔ اس جنگ کے بعد واشنگٹن کی ناکام پردہ پوشی شہنشاہی بھوک کی اشتہاء انگیزی کے لیے دو پیش رفت ہوئیں۔ ایک تو امریکہ دنیا کا غیر متنازعہ فوجی لیڈر بن گیا، دوسرا عرب دنیا کے قلب میں ایک دور دراز فوجی چوکی کی حیثیت سے اسرائیل کا معرضِ وجود میں آنا۔ اسرائیل کا بپتسمہ کئی حوالوں سے انوکھا امر تھا۔ یہ ریاست لفظی نوعیت کے حساب سے ایک ''گناہ'' سے پیدا ہوئی۔ یورپی اور امریکیوں نے مل کر نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کے اعترافِ گناہ اور کفارہ کے طور پر صیہونی تحریک کو ایک ریاست دینے کا فیصلہ کیا، صحیح معنوں میں تھال میں پیش کرنے کا، یہ ریاست کہیں یورپ میں نہیں بنائی گئی بلکہ فلسطین میں۔ یہودی ریاست کے لیے یہ سرزمین ان سے نہیں چھینی گئی جنہوں نے یورپی یہودیوں کے خلاف

بربریت میں حصہ لیا تھا بلکہ ان بے چارے فلسطینیوں سے لی گئی جنہوں نے نازی بربریت میں ذرا بھر شرکت نہ کی تھی لیکن اسرائیل امن سے معرضِ وجود میں نہیں آیا۔ صیہونیوں نے ایک خونی دہشت گرد تحریک کی خدمات لیں تاکہ معصوم اور خوفزدہ فلسطینیوں کو ان کے آبائی گھروں سے نکالا جا سکے اور ساتھ ہی فلسطین میں برطانوی اختیار اور حاکمیت کو پراگندہ کیا جائے۔ جس طرح ایوی شیلم (AviShalim) اپنی کثرت سے چھپنے والی تصنیف ''آئرن وال: اسرائیل اینڈ عرب ورلڈ'' میں اظہار کیا۔ صیہونی تحریک نے برطانیہ کو ان کے یہودی وزیرِ خارجہ جیمز آرتھر بیلفور (James Arthur Balfour) کے ذریعے، ایک یہودی ریاست کے قیام کا وعدہ کروایا اور اس مقصد کے حصول کے لیے دہشت گردی میں استعمال ہونے والا کثیر سرمایہ امریکہ سے آیا۔ صیہونی مہم کی ایک خاص شق یہ تھی کہ زبردست عسکری قوت کے ساتھ ایک ناقابلِ تسخیر اڈہ بنایا جائے اور یہ کام امریکہ نے بڑے شاندار طریقے سے سرانجام دیا۔ واشنگٹن نے صیہونیوں کو ناامید نہیں کیا بلکہ یہودی لابی کی اس مہم کی سرپرستی کی جس میں وہ ایک سرزمین پر اپنی ریاست کا قیام چاہتے تھے جو ان کے خیال میں خدا کی طرف سے انہیں عطا ہوئی ہے۔

جنگِ عظیم دوم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی سرد جنگ نے امریکہ سے دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کا موقعہ چھین لیا تھا لیکن مشرقِ وسطیٰ کے حوالے سے امریکی خارجہ پالیسی پر یہودیوں کے اثرات اس سرد جنگ کے دوران خاصے عیاں ہوئے۔ واشنگٹن میں عرصہ دراز سے کام کرنے والی صیہونی قوتوں کا صرف ایک لائن پر مبنی لائحہ عمل تھا۔ ''اسرائیل کو عسکری طور پر ناقابلِ تسخیر بنانا'' اور اس کی کامیابی کے لیے ابتداء ہی سے یہ ضروری تھا کہ امریکہ اپنے شہنشاہی طور طریقوں، نمود و نمائش پر جلد ہی اُتر آئے۔

۱۹۷۹ء میں افغانستان پر حملہ کی حماقت اور اس کے اثرات کے طور پر روس کی شکستگی روسیوں کے لیے تباہی کا آغاز تو تھی ہی مگر امریکہ کے لیے ایک نوید بھی تھی کہ یہ نہ صرف اس زمین پر سب سے بڑی عسکری قوت بن گئی ہے بلکہ سلطنت روم کی تشکیل نو ہوگئی ہے۔ اکیسویں صدی کے لیے امریکی خاکہ، جس پر روس کے منقسم ہونے کی امریکہ پالیسی کے ہم خیالوں اور یہودیوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کے بنیادی اصول کے طور پر، اپنی لامحدود عسکری قوت کی وجہ سے امریکہ اکیسویں صدی کا روم ہے۔ دستاویز جس میں جارج ڈبلیو بش کے وائٹ ہاؤس میں آتے ہی نئی روح پھونکی گئی، اس کے مصنف جو رپبلکن پارٹی کے زعما اور امریکی سپریم کورٹ کی کوششوں سے اقتدار میں آئے، وہ پاؤل وولفورٹز (PaulWalfwitz) اور رچرڈ پرلی (Richard Perle) تھے جو اب عراق کے خلاف ملامتی بوچھاڑ کے اصل محرک ہیں۔ یہ دونوں، ڈک چینی اور ڈونلڈ رمزفیلڈ کی نوازشات سے عراق کے خلاف عسکری مہم تیار کرنے والے ہیں کیونکہ یہ دونوں اس مقصد میں کامیاب ہوئے کہ ان کے بنائے ہوئے منصوبے ۲۱ویں صدی کے لیے بش کی دستاویزات ''پیکس امریکانہ'' کو قبول کیا گیا۔

نئے شہنشاہیت پسند اب عراق کے خلاف فہرست لیے کھڑے ہیں اور اسی قسم کا ردِعمل ایران اور شام کے خلاف کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ یہ اس طویل فہرست میں سے ہیں جو قوت اور توانائی کے حوالے سے ''متنازعہ'' ہیں اور وہ اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں امریکہ نے وہ عسکری قوت اور عالمی پہنچ حاصل کر لی ہے جو روم کے بامِ عروج کے لیے باعث حسد و رشک ہو۔ روم کے پاس بھی وہ حربی قوت نہ تھی جو واشنگٹن حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے لیکن امریکہ کی نسبت کم عسکری صلاحیت کے باوجود روم نے اپنے

عروج کے دور میں شاندار حکمرانی کی کیونکہ اس نے اپنے فیصلے خود کیے (جارج ڈبلیو بش نے اس سال جنوری میں اپنے سٹیٹ آف یونین خطاب میں بڑے متکبرانہ انداز میں اس بات پر زور دیا) اور اس میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ بغیر کسی بیرونی مدد کے عسکری قوت سے انہیں پایہ تکمیل تک پہنچاتا تھا۔ روم نے کسی مجبوری یا معذوری کو اپنے سامراجی عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیا۔

جارج بش نے عراق پر اپنے چند ''راضی برضا'' حمایتیوں کے ساتھ عراق پر لشکر کشی کے فیصلے سے بیشتر اقوام متحدہ کو حقیر سمجھتے ہوئے روم کی اس تمثیل کو مکمل طور پر پیش نظر رکھا۔ نئے روم کی سلامی کے طور پر عراق کا چناؤ، بطور ایک اثر قبول کرنے والے کے ان کے منصوبے بنانے والوں کے خیال میں ایک جوڑ توڑ کا ایسا سلسلہ ہے جو دانستہ طور پر کیا گیا اور نہایت عمدگی سے تشکیل دیا گیا۔ اس میں نوزائیدہ شہنشاہیت اور صیہونی مفادات کا مکمل خیال رکھا گیا اس کی کامیابی سے عراق کے پڑوسیوں کے دلوں میں جو خوف پیدا ہوگا وہ ایک ذیلی مفاد ہوگا۔ عراق مشرقِ وسطیٰ کی تین اہم ترین عرب ریاستوں میں سے ایک ہے، اس کے علاوہ دوسری ریاستیں مصر اور سعودی عرب ہیں یہ دونوں عرصہ دراز سے امریکہ کی حامی اور باوفا پیروکار رہیں۔ عراق کے ''کینسر'' کو ختم کرنے سے آنے والی کئی دہائیوں کے لیے اسرائیل کو تحفظ فراہم ہوگا۔ یہ صورتِ حال ہنری کیسنجر، جو نئے سامراج کا پرزور حامی اور صیہونی ہے، کی پیش بینی کے عین مطابق ہے جب اس نے ۱۹۷۳ء میں پہلی مرتبہ تیل کی پابندی پر صورتِ حال سمجھ لی تھی۔ امریکہ اپنی ''دشمن'' عرب ریاستوں کو ایک ایک کر کے لے گا، اسی نے اپنی کمان کے دوران بھرپور تکبرانہ انداز سے کہا تھا اور یقین دلایا تھا کہ خلیج کے تیل کے ذخائر اُسے فراوانی سے دستیاب ہونے چاہئیں ورنہ اس کی اور اس کے مغربی بلاک کے ساتھیوں اور جاپان کی معیشت خطرے میں پڑ جائے گی۔ امریکی کمپنیوں کے مرہونِ منت عراق کے وسیع تیل کے ذخائر ان کے لیے کئی دہائیوں کے لیے کافی ہیں۔ واشنگٹن اور اس کے اتحادیوں کو اس مسئلہ پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بے شک جارج بش کے غیر ذمہ دار اور متکبر رویے اور جنگ کے خلاف عوامی جذبات کو رَد کرنے سے دنیا میں غم و غصہ کے جذبات ابھرے، ''قدیم یورپ'' بھی اس صف میں شامل رہا مگر تنقید کا جو لہجہ شروع میں بہت تلخ و ترش تھا وہ عراق میں امریکہ فوج کی پیش رفت سے خاصا معتدل ہوتا چلا گیا۔ اب تنقید نگار بھی بڑے واضح لہجہ میں امریکہ کی فتح اور جنگ کے خاتمے کی دعا کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ تخمینہ لگانا بے جا نہ ہوگا کہ امریکہ مخالف موڈ، جو بغداد پر میزائل برسنے سے پہلے امریکہ کی یک طرفہ پالیسی کے خلاف بڑا جرات مندانہ تھا، امریکہ کے رویہ اور پالیسی میں بہتری سے تبدیل ہو جائے گا۔ یہ تبدیلی دو چیزوں پر محمول ہوگی، بے شک وہ بیک وقت واقع ہوں یا یکے بعد دیگرے، ایک تو امریکہ کی اس بات پر رضامندی کہ وہ اس میں اور دلچسپی رکھنے والی پارٹیوں (ملکوں) مثلاً فرانس اور روس، جن کو عرصہ دراز سے عراق کے لامحدود تیل کے ذخائر سے دلچسپی تھی، کے ساتھ اپنی عراقی ''ڈِش'' کو بانٹے۔ صدام حسین نے ان دو ملکوں کو عراقی تیل کے ذخائر اقوام متحدہ کی عائد کردہ پابندیوں کے ختم کرنے کی پیشگی کے طور پر دیئے۔ واشنگٹن کا ان انعامات کے سلسلے میں اتفاق رائے پیرس اور ماسکو کو بھی جلد ہی اس کی صف میں شامل کر دے گا۔ اسی طرح اقوامِ متحدہ کا عراق کی ہر شعبہ میں، معاشی اور سیاسی، تعمیرِ نو میں اہم کردار یورپ میں موجود یک طرفہ امریکی قوت کے خلاف موجود رکاوٹوں کو بھی دور کر دے گا۔ ان کی اپنی لمبی یادداشتوں کے ساتھ، جن میں اپنی سابقہ نوآبادیوں کا استحصال شامل ہے۔ یورپی عراقی مال

غنیمت کو صرف واشنگٹن کے لیے چھوڑنے سے نفرت ہی کریں گے اور اس سلسلے میں وہ استحقاق اور اخلاقیات کے حوالے سے اقوام متحدہ کی ناکامی کے آرزومند ہوں گے۔ بظاہر یورپی لوگوں کے لیے اس بتدریج ظاہر ہوتے ہوئے منظرنامے میں بہت رجائیت اور اچھی امید کی گنجائش ہے لیکن ڈرامے کے اصل کردار کے لیے ایک بیش بہا چیز جو اس میں پائی جاتی ہے وہ تہذیبوں کا ٹکرانا ہے۔ بے شک نادانستگی میں آنے والی دہائیوں میں اس نے تہذیبی تصادم کے بیج بو دیئے، لیکن فی الوقت امریکی لشکر کشی اور عراق پر ممکنہ لمبا قبضہ برہنہ سامراجیت کی یلغار کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کے لیے بڑی یا چھوٹی قوت کی حامل دو طاقتوں کا ہونا ضروری ہے۔ نہ تو اسلامی بلاک میں کوئی قابلِ ذکر قوت ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لیے کوئی اسلامی بلاک یا تہذیبی قوت ہے جو اس کا اظہار کر سکے۔

مسلم اُمہ کی نااتفاقی جو اس اہم موڑ پر مشرقِ وسطیٰ میں تباہ ہوتی ہوئی دیکھی گئی ہے، وہ کسی ایسی قوت، یا کسی بھی ایسی خواہش کی عدم موجودگی کا واضح اعلان ہے کہ جو اس نئے شاہی روم کا مقابلہ کر سکے۔ یہ محض اتفاق ہی ہوگا اگر عراق پر عائد شکست عرب یا اسلامی دنیا کے دلوں میں کوئی چنگاری بھڑکا دے اور اس شکستہ امت مسلمہ کے طبقوں میں اتحاد کو فروغ دے لیکن حقیقت پسند کے لیے اس موقعہ پر یہ امکان خام خیالی پر مبنی ہوگا۔

❋ ❋ ❋

ڈاکٹر قاضی عابد

قیامت

(۱)

آسمان پر اُڑتے طیاروں اور فضا میں پھٹتے بموں نے پورے گھر کے ماحول کو خاموش اور افسردہ کر رکھا ہے۔ ننھا الخماش کئی دن سے کھیلنا بھول گیا ہے۔ اُس کے کھلونوں میں رکھا ہوا جہاز بھی اب اُس کا دل نہیں لُبھاتا۔ وہ اب جہاز کو اُڑانے کی بجائے فضا میں اُڑتے ہوئے طیاروں اور اُن سے نکلنے والی موت کی روشنی دیکھ کر کبھی جویرہ کی گود میں چھپنے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی ڈر کر طیّب کی بانہوں میں گھس جاتا ہے۔ خاموش ماں باپ باری باری اُس کی معصومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کل ہی اُس نے بڑی معصومیت سے جویرہ سے پوچھا تھا، ''امی! میرے جہاز کے سیل ختم ہوتے ہیں تو وہ نہیں اُڑتا، اِن جہازوں کے سیل کب ختم ہوں گے؟'' جویرہ کی خامشی نے جواب دینے کی کوشش کی تھی اور پھر طیب سے ہم کلام ہوگئی تھی، ''خماش کے جہاز کے لیے سیل ہم خود خریدتے ہیں جب کہ اِن جہازوں کا ایندھن ہمارا ہی تیل، نہیں اب ہمارا خون ہے، جب ہمارا خون ختم ہوگا یہ جہاز بھی اُڑنا چھوڑ دیں گے۔'' طیب کی آنکھوں میں لحظہ بھر کو ایک چمک اُبھری لیکن فوراً ہی ماند پڑ گئی۔ اُس نے اِس چمک کو پھر پیدا کرنے کے لیے لفظوں کا سہارا لینا چاہا ''ہمارا ایندھن ہمارا حوصلہ ہے اور یہ کئی صدیوں تک ختم نہیں ہوگا۔'' جویرہ کی خشک آنکھوں میں پھر سوال اُترا ''ہم تو خالی پیٹ بھی رہ لیں گے لیکن خماش کا دودھ؟'' طیب کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر ویرانی اور مایوسی نے پھیلنا چاہا۔ باہر کہیں بم گرا، دھماکہ ہوا اور چیخیں اُبھریں۔ لیکن اُس کی آنکھوں نے کھوئی ہوئی اُمید کو ایک مرتبہ پھر دریافت کر لیا ''جہاں لوگوں کا خون طیاروں کا ایندھن بن رہا ہو وہاں بچّے دودھ کو بھول جاتے ہیں یا پھر انھیں دودھ کی ضرورت نہیں رہتی وہ بڑے ہو جاتے ہیں''۔ جویرہ نے کہا، ''اُمید بھرے یہ لفظ جس طرح جنگ نہیں روک سکتے، ہمیں روٹی نہیں دے سکتے، گھروں کو بربادی سے نہیں بچا سکتے، سپاہی کو موت سے محفوظ نہیں کر سکتے، اسی طرح خماش کے خالی پیٹ کے لیے دودھ بھی نہیں بن سکتے''۔ طیب نے کہا ''مجھے خبر ہے کہ یہ لفظ ہیں اور لفظ دودھ نہیں ہوتے لیکن باہر موت ہے اور موت بھی دودھ نہیں ہوتی، مجھ سے اُمید اور لفظوں کے سہارے تو نہ چھینو''۔ بغداد شہر کی ایک کھلی سڑک پر واقع کاظم پلازہ کے فلیٹ نمبر ۴۰۵ میں جویرہ، طیب اور الخماش لفظوں کے سہارے موت کے انتظار میں زندگی سے لڑ رہے ہیں۔

(۲)

ٹی وی سکرین پر دکھائی جانے والی اس جنگ نے میرے گھر کو بھی میدانِ جنگ بنا دیا ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا شہریار اُڑتے طیاروں، بموں اور نشانے پر لگتے سکڈ اور کروز میزائلوں کو دیکھ کر اُسی طرح تالیاں بجا رہا ہے جس طرح وہ سائنس، فکشن کے موضوع پر کسی فلم کو دیکھ کر بجاتا تھا۔ اُسے خبر نہیں کہ یہ جنگ ہے اور جنگ فکشن نہیں ہوتی۔ تالی تو میں بھی بجاتا ہوں لیکن مجھ سے یہ تالیاں میرا اعلیٰ گریڈ، سرکاری بنگلہ اور لمبی گاڑی بجواتی ہیں اور میری زبان اور قلم ملک کی خارجہ پالیسی کی مدح سرائی کرتے نہیں تھکتے، مصلحت کو میں نے زندگی کی قدر کے طور پر اپنا لیا ہے۔ کل میں نے وہ جلوس نہیں دیکھا تھا جو شہر کے بڑے چوک سے گزرا تھا اور نہ مجھے کہیں ہڑتال نظر آئی تھی کیوں

کہ میں خود دفتر میں موجود تھا۔ دوڑتی جوانی کو قابو میں کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی میری خوبصورت بیوی کبھی مجھ پر ہنستی ہے اور کبھی میری حالت دیکھ کر افسردہ ہو جاتی ہے۔ بیس سالہ رفاقت میں وہ میری مجبوریوں اور اپنی خوشیوں کے درمیان موجود تعلق کو پہچان گئی ہے۔ اب اُسے ملک کی خارجہ پالیسی سے زیادہ اُن غیر ملکی اشیاء کی فکر ہوتی ہے جو گھر کی خوبصورتی میں اضافے اور اپنی ہمسائیوں کے درمیان تفاخر کا باعث بنتی ہیں لیکن میرے نوجوان بیٹے کی آنکھوں میں میرے لیے ایک واضح نفرت کئی دنوں سے ٹھہر گئی ہے۔ وہ صبح کالج جاتے وقت اپنے پسندیدہ رہنما کی تصویر کا اسٹکر جیکٹ پر سجا کر اور ایک نفرت بھری ہُنہ مجھ پر اُنڈیل جاتا ہے۔ جذباتی سا لڑکا بے چارہ، اُسے کیا معلوم۔ اُسے بس ملک کی خارجہ پالیسی ہی دِکھائی دیتی ہے لیکن میں اُس کے مستقبل سے خائف نہیں۔ میرا بیٹا ہے، آخرِ کار اُسے بھی زندگی کی آسائشیں مصلحت آشنا بنا دیں گی۔ اُسے کبھی نہ کبھی پتہ چل ہی جائے گا کہ گھر بہر حال عراق سے بہتر ہوتا ہے۔

(۳)

کابینہ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ وزیرِاعظم اپنے سیکرٹری سے ملک میں جلسے جلوسوں اور ہڑتالوں کی غیر سرکاری رپورٹ مانگتا ہے۔ ایک غصیلی نظر وزیرِ داخلہ پر ڈال کر کہتا ہے ''آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے، یہ جلوس کون نکال رہا ہے، خفیہ والوں سے رپورٹ مانگو اور مخالف پارٹی کے لوگوں کو اندر کر دو''۔ وزیرِ داخلہ وزیرِ اطلاعات کو دیکھتا ہے اور وہ بے بسی سے وزیرِ خارجہ کو۔ وزیرِاعظم ایک مرتبہ پھر دھاڑنے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے ''احمق لوگ! میرے امن مشن کو کیوں نہیں سمجھتے، کیا لوگ ٹی وی نہیں دیکھتے اور سرکاری اخبار نہیں پڑھتے''؟ وزیر نے شرمندہ ہو کر کہا ''سر! لوگ یا تو ٹی وی بند کر لیتے ہیں یا آنکھیں''۔ وزیرِاعظم نے اُکتاتے ہوئے کہا ''آخری بات ٹھیک ہے'' پھر وہ وزیرِ مذہبی امور کی طرف مُڑا اور کہا ''مولانا! ان مولوی صاحبان کو کیا ہوا؟ کیا آپ نے خفیہ فنڈ سے اور زکوٰۃ فنڈ سے ان کی امداد بند کر دی ہے؟ مولانا فتح محمد اور علامہ سالک کو پکڑو، کوئی مشائخ اور علماء کانفرنس کرو، انھیں بتاؤ کہ ہم پاکستان کے تحفظ کی خاطر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ انھیں عمرہ وغیرہ کراؤ، کہیں سیر و تفریح کے لیے بھیجو اور ہاں انھیں یہ بھی کہو کہ وہ اپنی تقریروں میں اُس لیڈر کی کمیونزم دوستی اور اسلام دُشمنی، ہمارے ایک دُشمن پڑوسی کے ساتھ دوستی، حرمین شریفین پر حملہ اور اس قسم کے دوسرے ریفرنسز کے ساتھ ہمارے امن مشن کا خصوصی تذکرہ اور کامیابی کی دُعائیں، جمعۃ المبارک کو خصوصاً''۔ وزیرِ مذہبی امور نے کہا ''All right Sir، ایسا ہی ہوگا''۔

(۴)

شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر ڈگلس حقوقِ انسانی، امن اور تاریخ و جغرافیے کی ماہیت و اہمیت پر لیکچر دے رہا ہے۔ وہ قوموں کی تاریخ کے حوالے سے اور پھر دوسری قوموں کو فتح اور تسخیر کرنے کے اسباب و علل اور نتائج پر روشنی ڈال رہا ہے۔ کلچر کیا ہوتا ہے؟ کسی قوم کی روایات کیا ہوتی ہیں؟ مہذب قومیں اپنی نسلوں کو ورثے میں کیا دیتی ہیں؟ قوموں کی زندگی میں اہم سوال (زندگی اور موت کے) کب پیدا ہوتے ہیں؟ وہ زندگی کی جدوجہد میں کیوں شامل ہوتے ہیں۔ کن معاشروں میں حقوقِ انسانی کی پامالی ہو رہی ہے اور پھر ایمنسٹی انٹرنیشنل کے حوالے سے اُن ممالک کا تذکرہ، رہوڈیشیا، جنوبی افریقہ، چین، لاطینی امریکہ وغیرہ وغیرہ جہاں انسان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک ہوتا ہے۔ اُس نے کہا ''جو قومیں اپنی یا اپنی تاریخ کی شناخت کرانا چاہتی ہیں، اپنی تاریخ کو صحیح

انسانی اقدار کی امین بنا کر مثالی حیثیت میں دُنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہیں، جن کا کلچر مہذب اور انسان دوست ہوتا ہے، جہاں فرد کو آزادی حاصل ہوتی ہے، وہ اقوام نہ صرف اپنے جغرافیے کا احترام کرتی ہیں بلکہ دوسروں کے جغرافیے کا تحفظ بھی اُن پر فرض ہوتا ہے'' ایک طالب علم نے اُٹھ کر سوال کیا "Sir! What about the Gulf crisis?"___ مہذب پروفیسر خاموش ہو گیا۔ اُس کے ضمیر کے اندر سچ پرندے کی طرح پھڑ پھڑایا لیکن ہونٹ خاموش رہے۔ پچھلی قطار میں بیٹھے ہوئے کسی طالب علم نے بے ساختہ کہا:

"For the defence of Oil Culture and Israel"

(۵)

بند کمرے میں U.N.O. کے پانچ بڑوں کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ایک بڑے نے یہ کہہ کر اجلاس میں شمولیت سے انکار کر دیا ہے کہ وہ تماشہ نہیں تماشائی بننا چاہتا ہے۔ وہ جنگ کی ہولناکی ٹی وی پر دیکھے گا اور اپنے عوام کو دکھا کر امن دوستی کی قدر پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ دوسرے دو اہم بڑے ساٹھ سال بعد ایک مرتبہ پھر ایک کمزور ملک پر قبضے اور مشترکہ مفادات کے تحفظ کی خاطر اپنے اتحاد کو خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ باقی دو اپنی آدھی اہمیت سے آگاہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو دیکھ کر مُسکرا رہے ہیں۔ مسٹر ایکس نے کہا ''یسوع مسیحؑ نے ہمارے صدیوں کے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کا موقع دیا ہے اب خلیج ہماری کالونی ہوگی''۔ اُس نے سامنے پڑے مشروب کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مسٹر زیڈ کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ مسٹر زیڈ نے کہا ''آہ! تیل کے چشمے جو کہ دولت کے سرچشمے ہیں، اب ہمارے لوگ صدیوں بھوکے نہ مریں گے، ہمارے بینک دیوالیہ نہ ہوں گے اور ہماری صنعت اور ٹیکنالوجی اور زیادہ ترقی کرے گی''۔ مسٹر وائی نے اُن کی لاتعلقی کو محسوس کرتے ہوئے خشمگیں لہجے میں سوال کیا ''ہمیں جنگ کی صورت حال کے بارے میں بتایا جائے؟'' مسٹر ایکس نے مشروب کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور مطمئن لہجے میں کہا ''بس چند دنوں تک زمینی حملہ، فرنٹ لائن پر چھوٹے اتحادی ملکوں کی فوجیں، ہمارے آدمی پیچھے اور اسلحہ آگے ہے''۔ مسٹر زیڈ نے مُسکراتے ہوئے کہا ''مسٹر ایکس چلو تمھاری چالیس سال کا جمع شدہ اسلحہ اور بے کار فوج تو کسی کام آئی'' مسٹر ایکس نے جواباً کہا ''اگرچہ ہمیں کچھ زیادہ ہی حاصل ہوگا لیکن بندر بانٹ اب بھی مساویانہ ہوگی''۔ مسٹر وائی نے ایک مرتبہ پھر اپنی اُکتاہٹ توڑنے کی کوشش کی ''ہماری عوام ہم سے جنگ کے اسباب و نتائج اور مصارف کا حساب طلب کرتی ہے''۔ مسٹر ایکس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکاتے ہوئے تھوڑے سے تیز لہجے میں کہا ''اسباب و نتائج کو گولی مارو، مصارف ہم نہیں مرنے والے خود ہی ادا کر رہے ہیں''۔

(۶)

سعودی عرب کے خوبصورت شہر ریاض میں بذریعہ ہوائی جہاز دس ہزار گوری میموں نے اس خطّے کو جنّت نظیر بنا دیا ہے۔ شام کے وقت یہ سیر کرنے یا شاپنگ کرنے نکلتی ہیں تو صحرا کو فردوس میں بدل دیتی ہیں۔ وہ اس دھرتی کا تحفظ کرنے والی اتحادی افواج کو گناہ سے بچاتی ہیں جو کہ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں اور گھر چھوڑ کر صحراؤں میں آن بسے ہیں۔ اس طرح یہ بالواسطہ اسلام کے لیے قربانی دی رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان خواتین کی قربانی سے بہت خوش ہیں کہ انہوں نے مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے گھروں کو چھوڑ دیا ہے اور حرم شریف کے غیر مسلم محافظوں کے دل کو لُبھانے کا اجر بے حد عظیم ہے۔

پروفیسر اصغر علی شاہ

عراق کی بربادی پر ایک نوحہ

لاکھوں اشک ، کروڑوں آنسو آنکھوں سے آزاد ہوئے
سینکڑوں بین ، ہزاروں نوحے ہونٹوں پر آباد ہوئے
قریے ، قصبے ، نگر ، مدینے خاکستر کا ڈھیر بنے
بستیوں ، گاؤں ، شہروں سے ناپید آدم زاد ہوئے
مردوزن بچے کہ بوڑھے طفل و جوان و شیخ و شاب
سب ایندھن آتش کا بنے ، خورد و نوشِ فولاد ہوئے
حلّہ بابل میں بدلا کوفے میں نجف تبدیل ہوا
بیس دنوں میں بھوت نگر موصل بصرہ بغداد ہوئے
ناصریہ دیوانیہ ذی الکفل سماوہ اُمِ قصر
تکریت و کرکوک سلیمانیہ سب برباد ہوئے
کوت عمارہ قائم ناؤ مولد ابراہیمی اُر
محروم امداد تھے جب حقدارِ استمداد ہوئے
بھر کے بلیئر بش نے قنابل دوزخ کے انگاروں سے
بستے شہروں پر برسا کر دونوں خرم شاد ہوئے
بحری جہازوں سے صاروخ اور بم باری تھی فضاؤں سے
مردوزن ٹکڑے ہو کر کھنڈر کھیتوں کی کھاد ہوئے
اک صدام حسین کی خاطر کربِ بلا میں پورا عراق
کتنے شہر بنے کھنڈر اور گاؤں بے بنیاد ہوئے
بکتر بندوں سے بوڑھے ٹینکوں سے لتاڑیں بیوائیں
توپوں سے چڑیوں جیسے بچے صید صیّاد ہوئے
سب لیلائیں کل شیرینیں آجائیں گی قبضے میں
سات سمندر پار میں اب وہ مجنوں اور فرہاد ہوئے

عمر، اسامہ اور صدام کی گردنوں پر ہیں لاکھوں خون
جو وجہ افساد ہوئے اور باعث ایں افتاد ہوئے
مرجاتے تو زندہ رہتے رتبہ شہادت کا پا کر
زندہ ہیں تو خوار حجّل حقدار مردہ باد ہوئے
چاروں طرف اسلامی ممالک بہرے مَلک اور گونگے صدر
چپ کے روزے رکھے قبرستانوں کی روداد ہوئے
بھولے تھے منگولی تباہی دجلہ بغداد اور فرات
محشر میں بھی یاد رہیں اسباق وہ اب کے یاد ہوئے
مٹی کے بنے افغانیوں اور خاکی عراقیوں کی خاطر
برطانی ، امریکی ، ناری جنّوں کی اولاد ہوئے
اعلان ہے جارج اور ٹونی کا اور خبر ضعیف ممالک کو
جس پر چاہو چڑھ دوڑو قانون نئے ایجاد ہوئے
شوریٰ کون سلامتی والی مجلسِ عام ممالک کیا
طاقت اول درجہ ہم حقدارِ استرداد ہوئے
اعلیٰ تہذیبی انگریزی اور مہذب امریکی
منگولوں اور نازیوں کے سفاکی میں استاد ہوئے
پورے ملک کو آگ لگا کر کرنا جنت کی تعمیر
افرنگی نمرود بنے اور مانندِ شدّاد ہوئے
عام عراقی ناداروں کمزوروں اور معصوموں پر
عالم کی دو جنگوں کی نسبت سے ظلم زیاد ہوئے

❋❋❋

پروفیسر شریف اشرف

دوسرا محاذ

(بصرہ یونیورسٹی کا ایک منظر)

''میں معلّم ہوں''
اک غمزدہ شخص نے
اک سپاہی سے یہ رگڑ گڑا کر کہا
ایک تھپڑ پڑا، ایک گولی چلی
پھر معلّم نہیں خاک کا ڈھیر تھا
خاک پھر خاک ہے خون پھر خون ہے
خاک سہی رہی، خون بہتا رہا
خون بہتا رہا اور لکھتا رہا
''میں معلّم ہوں، بس اک معلّم ہوں میں
میں ثنا خواں ہوں انساں کی تکریم کا
میں ثنا خواں ہوں انساں کی تکریم کا

❋ ❋ ❋

ڈاکٹر علی اطہر

جہانِ نو کے یہ خود ساختہ آقا

تکبّر اور طاقت کے نشے میں
مست ہاتھی
روندنے نکلے ہیں انسانوں کی نسلوں کو.....
کہ یہ ہے ''برتری'' کا اور ''تفاخر'' کا
نیا معیار اُن کی بے بہا اقدار کا حصہ.....
شعورِ ذات، جمہوری نظامِ عدل و آزادی کے بینر
ٹینک کے قاتل دہانے پر
سجا کر
خون میں لت پت
کلاشنکوف کی اندھی، سیاہ بیرل پہ
امن و آشتی کی فاختہ کا نام
لکھ کر
اِک جہانِ نو بسانے کا ارادہ ہے
جہانِ نو..... جہاں خوش حالیاں ہوں گی
زمیں جنت بنے گی
شرط یہ ہے کہ
جہنم کی اذیّت ناکیاں برداشت کرنی ہیں
عجب ہے فلسفہ
منطق عجب ہے
سوچ کے ''مثبت'' رویوں کی.....
جہانِ نو کے یہ خود ساختہ آقا سمجھتے ہیں
کہ جسموں کو گرانے سے
ارادے منہدم ہوں گے

دماغوں کی تجارت سے
عزائم معتبر ہوں گے.....
مگر یہ بھول ہے اُن کی
نئی دنیا کے اِن خودساختہ، بے حس
خداؤں کو یہ سمجھاؤ
تشدّد اور تباہ کاری کے جبر و بربریّت سے
مسکّن رات کے چہرے پہ شعلوں کی لکیروں سے
دنوں کی دلکشی پر
آہنی بارود ریزوں کی دہکتی سرخ دھاروں سے
بہت سی بے گناہ، مجبور اور مظلوم جانیں بھینٹ میں دے کر
زمیں، پیڑوں، پہاڑوں، دشت، صحرا، گاؤں، شہروں اور سمندر پر
بموں، بمبار طیاروں کے بل پر
حکمرانی ہو تو جائے گی
مگر انسان کا دل جیتنا ممکن نہیں ایسے.....

❋ ❋ ❋

نوشی انجم

چشمِ تر سے نظارہ

کبھی ساتھ چھوٹا جو اپنا زمیں سے
کبھی خواب اپنے نہیں گر رہے تو
پھر اِن آنسوؤں میں گھری نرم شوخی کو محسوس کرنا
ہوائیں چلیں گی
مگر سنسناہٹ میں ڈوبے کی راحت
دیے سے دیا جب جلانے لگو
تو یہ محسوس کرنا
ہے اک اک یہ لمحہ، کڑا زندگی کا
کبھی چاند تکنا تو مت تھامنا
بڑھ کے اُس کی کرن کو
کہ ایسی خطا میں تو خالی رہے گا
ہمیشہ ہی جیون
لہو کی لہر میں جو جذبے جلیں گے
انہیں مت بجھانا
کسی آنکھ سے بہتے آنسو کو گر پونچھ لینے میں
تم کو، لبوں کو، ہنسی سونپ دینے میں تم کو
اگر وقت سے بھی جھگڑنا پڑے تو
یہ سودائے جاں کوئی مہنگا نہیں ہے
چراغوں کی تھراتی ہے لَو ستم سے
جہاں پھول کھلنے سے پہلے ہی
اک اک کلی کو فنا ہے
جہاں پر محبت کے، نفرت کے،
سارے ہی جذبے
کوئی لہر بن کر بہانے چلے ہیں
جہاں جذبے، نغمے، ہنسی اور نمی سب
لہو بھی بدن کا جو باہم ملے ہیں
سمندر بنے ہیں
سمندر تو آخر سمندر رہے گا
بہالے گا سب کچھ
کبھی میں جو طوفانی لہروں کو دیکھوں
تو یہ سوچتی ہوں
کہ بغداد و بصرہ ہیں ایسا ہی لاوا
جہاں خوف سے ڈوبی چیخیں
اٹھائیں گی محشر.....!!!

شرکائے گفتگو: ڈاکٹر نعمت الحق، شوکت نعیم قادری

زوار حسین سے ایک مکالمہ

سوال: ہیئت، مواد اور زبان کی بحث بڑی پرانی ہے، اس بارے میں مختلف آرا ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں اولیت کس چیز کی ہے؟ اور کون سی صنف اردو شاعری میں زیادہ طاقت ور ہے؟

جواب: میرا بنیادی خیال ہے کہ ہیئت کہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں تبدیلی آنی چاہیے مگر پہلے ہمیں تبدیلی کے تصور پر غور کرنا ہوگا۔ کیونکہ تبدیلی ہر مقام پر ایک رفتار سے نہیں آتی۔ فزکس میں تبدیلی کے معیار کی پیمائش کی گئی ہے کہ عالم اشیاء میں جب ارتقا آتا ہے تو لاکھوں برس بعد اس میں معمولی سی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس کو ارتقائی وقت کہا جاتا ہے۔ ہم شاعری پر اس کا اطلاق اس لیے نہیں کر سکتے کہ شاعری کا دورانیہ بہت کم ہوتا ہے اسے ارتقائی وقت کے مطابق نہیں دیکھا جا سکتا۔ کروڑوں برس بعد آنے والی تبدیلی کو آج زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن شاعری کے حوالے سے میرا خیال ہے کہ غزل اردو شاعری کی اہم صنف ہے۔ کوئی شاعر اگر غزل نہیں کہہ رہا تو وہ شاعر نہیں ہے، یہ میرا ذاتی خیال ہے اور میں اس پر پورا یقین رکھتا ہوں خواہ وہ کتنا ہی بڑا نظم گو ہی کیوں نہ ہو اگر اس نے اچھی غزل نہیں کہی تو وہ شاعر نہیں ہو سکتا۔

سوال: اس میں تو راشد بھی آ جاتے ہیں۔

جواب: کوئی بھی ہو ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں میرا عقیدہ ہے اور ہر شخص کو رائے کی آزادی ہے کہ جو شخص روایت کے پورے شعور اور کرافٹس مین شپ کے ساتھ اچھی غزل نہیں کہہ سکتا وہ شاعر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر تخلیق میں کرافٹس مین شپ نہیں تو اسے دور پھینک دینا چاہیے۔ شاعری کی اساس یہ ہے کہ اسے ''شاعری'' ہونا چاہیے باقی معیارات بعد کے ہیں پہلے بطور شاعر وہ فنی اور تکنیکی سطح پر درست ہونا چاہیے جبکہ مغرب کا معیار دوسرا ہے۔

سوال: تو آپ غزل کو اردو شاعری کا مابہ الامتیاز سمجھتے ہیں؟

جواب: جی ہاں! اس وقت خصوصاً اردو شاعری جبکہ انسانی شعور بہت بلند ہے اور عملاً بھی یہی بات ہے۔ آزاد نظم کو رعایتی تصور کیا جاتا ہے نثری نظم کو شاعری تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن غزل کہنے والا صفِ اول کا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اب شاعری میں ہیئت کا تصور دیکھیں کہ شاعری کا اپنا منصب اور زندگی کا اپنا دائرۂ صفات ہوتا یہ کہ جس میں شاعری رہتی ہے، زندگی ایک بہت وسیع لفظ ہے میں آرنلڈ کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ شاعری تنقید حیات ہے حیات کے دائرے بہت وسیع ہیں اس میں زمین و آسماں کے سارے حوالے اور مخلوقات آ جاتی ہیں، فلکیات میں ہم چند ستاروں کے علاوہ کچھ جانتے ہی نہیں یہاں شاعری کیا کرے گی۔ شاعری کو اس میں نہیں گھسیٹنا چاہیے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اعمال یعنی فن ایک مخصوص دائرہ صفات میں رہے ان کا اپنا ایک منطقہ ہے۔

سوال: اگر آپ آرنلڈ کی رائے سے متفق نہیں، آپ کے خیال میں حیات ایک وسیع حوالہ ہے تو آپ ادب کو کیا سمجھتے ہیں؟

جواب: ادب کا اپنا منصب اور دائرہ صفات ہے اور وہ عملی اور منطقی طور پر جس قدر جگہ گھیرتا ہے وہی اس کا منصب ہے یہی اس کی سلطنت ہے اور یہ معمولی بات نہیں ہے۔ اس کو ہم اوورلیپ کیوں کریں۔ مداخلت بے جا کیوں کریں۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ شاعر وہی ہے جو غزل کہہ رہا ہے مگر دوسرا نقطہ نظر ہے کہ نثر میں بھی شاعری ممکن ہے یہ دو آراء ہو گئیں لیکن آیئے میرے ساتھ چلیں شاعری کی دو حرکتیں ہیں ایک اپنے محور کے گرد گھومتی ہے کو دو تین ہزار سالہ تاریخ نے معیار پوری دنیا میں متعین کر رکھا ہے اب یہاں شاعر کا اپنا مقام ہے جیسے طبیب کا اپنا مقام ہے ان کا اپنا دائرہ صفات ہے یہی حال شاعری کا بھی ہے اس کی اپنی سلطنت ہے۔

سوال: ادب کا وہ دائرہ کار کیا ہے؟

جواب: وہ یہ ہے کہ وہ خاص خاص موضوعات کو لے ہر موضوع کو نہیں۔

سوال: ان موضوعات کی نشان دہی بھی کرتے جائیں۔

جواب: وہ موضوعات زیادہ تر ایسے ہیں کہ جس کا ایسنس لیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں دلچسپ ہونا چاہیے۔ اگر وہ غیر دلچسپ ہیں اور کوفت پیدا کرتے ہیں تو وہ اس کے منصب سے خارج ہیں دوسری بات یہ ہے کہ شاعری فکر کو براہِ راست نہیں لا سکتی جیسے اقبال کی شاعری۔ اگر فکر کو لائیں تو افراط و تفریط ہوگی کہ شاعری جو زبان استعمال کر رہی ہے وہ فکر کے لیے موزوں نہیں ہے کیونکہ شاعری کی زبان فکر کو توڑے گی فکر کو بیان کرنے کے لیے منطقی اور استدلالی زبان کی ضرورت ہوتی ہے اب شاعری، زبان کو منطق اور استدلال کو جگہ جگہ سے توڑتی ہے وہ بھلا کیسے فکر کو پیش کر سکتی ہے۔

سوال: یعنی آپ اس رائے سے متفق نہیں کہ شاعری جذبے اور فکر کی آمیزش سے وجود میں آتی ہیں؟

جواب: عرض یہ ہے کہ چیزوں کے وجود میں آنے کا کوئی ایک ڈھنگ نہیں ہوتا مختلف اسالیب اور حوالے ہوتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے پورے طرح سے آنا اور نظری طور پر متعین کر دینا کہ یہ جو کام ہو رہا ہے اس کا یہ مطلب ہے ایک ہے کسی چیز کا جزو آنا، اشتراک کرنا جیسے ذائقہ ہے چائے تو اصل میں چائے ہے مگر اس کے کئی ذائقے ہیں۔ اس کی اصل حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی۔ مگر ادب میں جب بھی ایسا ہوگا مثلاً مارکسی ادب ہے اس میں خالص پن موجود نہیں جو شاعری کا اصل ہے۔ اس چیز کے نتائج اچھے نہیں ملتے۔ ایک عام سی مثال دیکھیں کہ جب آلات مقرر ہیں کہ پلاس سے پلاس کا کام لیا جائے گا اور آری سے آری کا تو آپ آری سے ہتھوڑی کا کام نہیں لے سکتے۔

سوال: مگر زوار صاحب جب غالب کا ذکر آتا ہے تو ناقدین اس کے تفکر کو اہمیت دیتے ہیں کہ اس کے کلام میں واضح طور پر فکر کی آمیزش بھی ہے اور اسی حوالے سے وہ ہم عصر شعرا سے منفرد ہوتا ہے اور اس کی شاعری اگلی صدی کی شاعری شمار ہوتی ہے اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے یہاں فکر کی اصطلاح کا یہ غلط استعمال ہے ہم کہتے ہیں کہ میر نے فکر کو شاعری میں براہِ راست استعمال نہیں کیا مگر ایک طبقہ فوراً کھڑا ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ نہیں میر کے یہاں تو زبردست فکر موجود ہے۔ اس طرح تلاش کریں تو وہ کون سی چیز ہے جس میں فکر موجود نہیں۔ میں فکر کی اصطلاح سے مراد باقاعدہ فکر لیتا ہوں جو منطقی حوالے سے ہو۔ یعنی ایک حوالے یا ثانوی صفت کے طور پر نہیں بلکہ باقاعدگی کے ساتھ۔ اب ہم یہ سائنس کے آدمی کو تھیسس لکھنے کو کہیں تو وہ شاعری کی زبان میں نہیں لکھے گا اگر وہ منطقی او

راستدلالی انداز اختیار کرے گا تو نتائج پر جلد پہنچ جائے گا شاعری کا معاملہ مختلف ہے وہ استدلال نہیں کرتی اس کا معاملہ جذبات کا ہے وہ تاثرات پیدا کرتی ہے جو بعض اوقات ناقابل گرفت اور ناقابل بیان ہوتے ہیں۔ اگر وہ فکر کو جزو اپیش کرے تو ہمیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے مگر جب ہم نظری طور پر چیزوں کو اپنے مقام پر رکھتے ہیں تو ہمیں ان کے منصب اور جواز پر غور کرنا پڑتا ہے۔ یوں شاعری اپنے دائرہ صفات میں رہتی ہے۔ اسی حوالے سے دیکھیں تو شاعری کا تعلق موسیقی سے بنتا ہے یہ چیز غزل میں ہے آپ اگر نثری شاعری کر رہے ہیں تو یہ ممکن نہیں ہے۔

سوال: مگر آپ کی کتاب اکیلی ہوا میں جو تجربہ کیا گیا ہے وہ نثری نظم کا ہے یا اسے شاعرانہ نثر کہہ لیں۔

جواب: جی نہیں میں اسے شاعری کہتا ہی نہیں ہوں وہ نثر ہے میں نے شاعری کا دعویٰ نہیں کیا یہ تو لوگ کہہ رہے ہیں۔ اب میں نے ماہ نو کو یہ ڈائیلاگ نثر کے طور پر بھیجے انہوں نے اسے نظم میں شامل کر دیا اب میں نے تو انہیں یہ نہیں کہا کہ اسے نظم میں شائع کرو۔

سوال: ان باتوں کے بعد یہ نکتہ ذہن میں آتا ہے کہ پھر بڑی شاعری کے لیے کن صفات کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

جواب: یہ بحث شاعری کے دائرہ صفات کے متعلق ہے اور اس میں آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کا دائرہ صفات کیا ہے؟ ایک تو لازمی شرط بتائی کہ موسیقی سے اس کا انسلاک ہونا چاہیے اگر اس میں یہ صفت نہیں ہے تو وہ آپ کے رگ و پے میں جاری نہیں ہو سکتی۔

سوال: مگر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کیا شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ موسیقی میں ڈھلے ہوئے مصرعے کہے یا یہ خود کار طریقہ کار ہے یا یہ القائی صورت حال ہے یا اس کا کسب ضروری ہے؟

جواب: اس کا القا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ القا اور چیز ہے یہ تو درمیان میں آ جائے تو آ جائے ورنہ غائب ہے ہم اس کا انتظار نہیں کر سکتے ہم تو انسانی کوشش پر بھروسہ کر سکتے ہیں ایک چینی مفکر کہتا ہے کہ میں کوشش کو وجدان پر اہمیت دیتا ہوں کیوں کہ وجدان میرے اختیار سے باہر ہے کوشش میرے بس میں ہے شاعری کے اپنے ذرائع اظہار ہیں اور اس کی اپنی تکنیک ہے مثلاً قافیہ، صوتی آہنگ، ہیئت، بحر، یہ ذرائع ہیں جن سے شاعری اپنے آپ کو وجود میں لاتی ہے یہ وجودی ذرائع ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو یہ وجود ہی نہیں رکھتی کیونکہ اگر وہ وجود رکھے گی بھی سہی تو اس کا تعلق کلام ناطق سے بنے گا اور شاعری کلام ناطق سے بلند چیز ہے۔ کلام ناطق کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد پورے کر کے ختم ہو جاتا ہے شاعری کا منصب یہ ہے کہ وہ ایسا فقرہ ایجاد کرے جو ختم نہ ہو بلکہ تا ابد قائم رہے اور اس کو تکرار فنا نہ کر سکے۔ تو یہ سب چیزیں شاعری کے آلات ہیں جو شاعری کو وجود دیتے ہیں اور یہ لازمی طور پر موسیقی میں منقلب ہو جاتے ہیں۔

سوال: تو کیا شاعری تشکیل جمال کا نام ہے؟

جواب: جی نہیں! جمال ایک الگ موضوع ہے جمال فن کی لازمی شرط نہیں ہے کیونکہ جب فن آتا ہے تو وہ جمال کو ان معنوں میں تسلیم نہیں کرتا جو عام طور پر مروج ہے۔ وہ جمال سے مراد فنی جمال لیتا ہے۔ اگر ایک مصور نے بدصورت انسان ایک نہایت مکروہ انسان کی تصویر بنائی ہے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ وہ خوبصوت نہیں ہم یہ دیکھیں گے کہ اس نے اسے بنایا کس خوبصورتی سے ہے۔ ہم اس کی فنی عظمت کو دیکھیں گے۔

سوال: اگر غزل زندگی کے مسائل سے عاری ہو تو روح عصر سے دور نہیں چلی جائے گی؟ اسی حوالے سے ایک سوال بھی ہو جائے کہ آپ نے کہا کہ شاعری کا براہِ راست تعلق زندگی کے مسائل سے نہیں ہے تو تعلق ہے تو سہی انسان ایک تعلق بنتا ہے کیا شاعری کو اس حوالے سے دیکھا جا سکتا ہے؟

جواب: دیکھیں جس دنیا میں ہم رہتے ہیں یہ روابط کی دنیا ہے، یہ رشتوں کی دنیا ہے کوئی چیز تنہا نہیں ہے۔ ہر چیز ہم سے متعلق ہے اور ہر چیز شاعری سے بھی متعلق ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ میں مثال دیتا ہوں کہ فرض کیا شاعری کو نظری سطح پر متعین کر لیا جائے کہ وہ مسائل کو دیکھتی ہے تو اس میں پچاس سال کا وقفہ آئے گا شاعری کا یہ ہاضمہ نہیں ہے کہ وہ کسی مسئلہ کو فوری بیان کرے یہی اس کا تکنیکی مسئلہ ہے کیونکہ اس کا اپنا ایک استعاراتی نظام ہے اس کی اپنی زبان ہے، صرف و نحو ہے، اس کا تعلق علم و معنی و بیان سے ہے اور پھر شاعری کی دیگر صفات سے اس کا تعلق ہے مثلاً وہ بلیغ ہے فصیح ہے۔ پھر اس کے اپنے انداز ہیں کہ یہ رمز ہے، یہ کنایہ ہے۔ یہ اشارہ ہے۔ اس کا اپنا ایک نظام ہے۔ ناقدین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کی یہ ساری آرائش کوئی فالتو شئے نہیں ہے بلکہ یہ اس کا اپنا ہی بدن ہے وہ اسی پر مشتمل ہے اگر اس سے یہ چھین لیا جائے تو شاعری غارت ہو جائے گی۔ یہ اس کا حسن بھی ہے۔

سوال: یعنی براہِ راست موضوعات نہیں آتے بلکہ کسی اور چینل کے ذریعے آتے ہیں؟

جواب: جی ہاں اور یہ سب شاعری کے ماتحت عنصر کے طور پر آتے ہیں۔ شاعری ان عناصر پر چھائی رہے گی۔ میں یہ کہوں گا کہ فکر کو وہاں لاؤ جہاں فکر اپنے آخری پیڈسٹل پر موجود ہو کیونکہ یہ ذہانت کی اعلیٰ ترین شکل ہے اور علم انسان کی فضیلت کا نشان ہے میں یہ کہوں گا کہ اسے شکستہ نہیں ہونا چاہیے اسے اپنے پیرائے میں رہنا چاہیے، اپنے سیاق و سباق میں رہے۔

سوال: اردو شاعری کی روایت میں غالب اور اقبال کی مثال ہے آپ کا نقطہ نظر سننے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ پھر ان شعراء کا وہ مقام نہیں بنتا جو ناقدین متعین کرتے ہیں۔

جواب: ان کا مقام بنتا ہے انہوں نے فنی حوالے سے بھی نہایت اعلیٰ اشعار کہے ہیں۔ فکر کو جزو کے طور پر لاتے ہیں غالب کو ہم بطور شاعر مانتے ہیں نہ کہ مفکر، وہ نہ ہی متکلم ہے۔

سوال: آپ نے غالب کے متعلق کہا اقبال کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: دیکھیں اقبال کسی بھی صورت میں فلسفی تو ہرگز نہیں ہیں علی عباس جلال پوری کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ کیونکہ جن کو فلسفی مانا گیا ہے ان کا کام مختلف ہے مشرق میں ابن رشد ہے (بعض لوگ اسے بھی فلسفی نہیں بلکہ محض شارح تسلیم کرتے ہیں) شوپنہار ہے اس نے ارادہ حیات کے تحت پوری کائنات اور زندگی کے فریم آف ورک کی شرح کی ہے، نطشے کو مانتے ہیں کہ اس نے قوت کے حوالے سے زندگی کی تعبیر کی، اب اسپنسر، کانٹ اور ہیگل وغیرہ ہیں کہ انہوں نے ایک مکمل نظام کو متعارف کروایا ہے۔ اقبال کے یہاں یہ نظام نہیں ہے خودی کا فلسفہ ان کا اپنا نہیں ہے۔ ''اپنے آپ کو پہچانو'' یہ بہت پرانا نقطۂ نظر ہے۔

سوال: پھر اقبال کے مقام کا تعین کیسے کریں گے؟

جواب: دیکھیں ایک ہوتا ہے باقاعدہ فلسفی اس کے لیے نثر ضروری ہے دنیا میں ایک بھی فلسفی ایسا نہیں جس

نے اپنے فلسفے کا اظہار شاعری کے ذریعہ کیا ہو۔ایک چیز مزاج اور رنگ کی ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ وہ فلسفی تو نہیں ہے مگر اس کا مزاج فلسفیانہ ہے یہ ایک رنگ کے طور پر آتا ہے غالب فلسفی نہیں ہے وہ رنگ کے طور پر اسے لایا ہے۔

سوال: پھر بنیادی طور پر اقبال کیا ہے؟

جواب: بنیادی طور پر اقبال ایک بہت عظیم شاعر ہے۔مگر اس کا رنگ فلسفیانہ ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں اردو کی تنقید کا معیار کیا ہے؟

جواب: گزارش ہے کہ تنقید اور تخلیق دونوں کے بارے میں کسی سے پوچھیں تو وہ یہ کہے گا کہ اسے زوال آ گیا ہے، اگر آپ یہی سوال مجھ سے کریں تو کہوں گا کہ اردو شاعری اس وقت اپنے بام عروج پر ہے۔میرے پاس اس کے ثبوت ہیں۔آپ ہندو پاکستان کے وسیع دائرے کو چھوڑیں صرف ملتان کو لیں تو مقدار نہیں ماہئیت کے اعتبار سے یہاں نہایت عمدہ شاعری ہو رہی ہے۔کوئی بھی عظیم المرتبت شاعر ساری باتیں اپنی طرف سے نہیں لاتا بلکہ روایت میں وہ باتیں ہو رہی ہوتی ہیں۔وہ ان میں سے چند اشعار لاتا ہے۔آپ غالب و میر کو پڑھیں ضروری نہیں کہ ان کا ہر شعر بلند مرتبہ ہے نہیں آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس بہت کم اشعار ہوں گے جو ان کے اپنے ہوں گے باقی باتیں روایت کے پس منظر میں ہو رہی ہوں گی۔ایک خاص مقام پر وہ ابھرتے ہیں اور وہی ان کی عظمت ہے۔ایڈگر ایلن پو مشہور شاعر جس نے اسی سال پہلے آغاز کائنات کے حوالے سے پیشن گوئی کی تھی وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی دنیا میں ایسی نظم نہیں ہے جو کاملتاً شاعرانہ ہو ہر نظم ساری کی ساری شاعرانہ نہیں ہوگی اس میں شاعرانہ صفت کہیں کہیں ستارے کی طرح چمکے گی۔یہی بات کہ شاعری ایسی چیز نہیں جو نثر کے ساتھ دوڑتی چلی جائے۔وہ تو بہت کم یاب ہے۔اسی طرح مشرقی شاعری کی ایک خوبی نازک خیال اور حد درجے کی شائستگی۔میں ایک شعر ملتانی شاعری کا پیش کرتا ہوں جو روایت میں آپ کو نہیں ملے گا اور جو نازک خیالی کی عمدہ مثال ہے اسلم انصاری کا شعر ہے۔

دیوار خستگی ہوں مجھے ہاتھ مت لگا
میں گر پڑوں گا دیکھ مجھے آسرا نہ دے

سوال: تنقیدی حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

جواب: میں بات کر رہا تھا اردو شاعری کی ایک اہم خوبی نازک خیالی کے بارے میں۔ہمارے یہاں ترقی پسندی کی لہر آئی پھر جدیدیت اور اب مابعد جدیدیت کی بات کی جاتی ہے مگر ہمارے یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ نازک خیالی بھی ہماری ایک صفت ہے مگر ہمارے یہاں جتنے بھی تنقید کے سانچے ہیں وہ سب مغربی ہیں کیونکہ ان کا آغاز افلاطون سے ہوتا ہے اور اس وقت سے آج تک کوئی دس بارہ تنقیدی دبستان ہیں وہ مغربی ہیں۔لہٰذا انہوں نے شاعری کی پرکھ کے لیے جو سانچے بنائے وہ مغربی تھے اور ان کا پورے طور پر مشرقی شاعری پر اطلاق ہی نہیں ہوتا۔

سوال: تو کیا مشرقی شاعری اور مغربی تنقیدی اصول ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں؟

جواب: اس میں جو کائناتی اور انسانی پہلو ہے وہ تو مشترک رہے گا کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو انسان ہوتا ہے۔میرا یقین ہے کہ انسان کا ایک بنیادی سانچہ ہے وہ جس زمان و مکان میں ہوگا وہ بطور انسان ہوگا اسی کو

آفاقیت کہیں گے کچھ آفاقی باتیں ہر ادب میں مشترک ملیں گی مگر کچھ رنگ زمینی ہوتے ہیں جسے تہذیبی رنگ بھی کہہ سکتے ہیں جو جغرافیائی حدود میں موجود ہیں مثلاً قندھار کی سرزمین ایک انار پیدا کرتی ہے دنیا بھر کی زمین پر اس کا بیج کاشت کر کے آپ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔یہاں عناصر کی اہمیت ہے گو تقسیم شدہ ہیں یہ آفاقی نہیں جغرافیائی اہمیت ہے۔میرا مطلب ہے کہ جہاں تک آفاقیت کا تعلق ہے جو مغرب کی روایت ہے وہ ہماری روایت ہے لیکن مقامی رنگ و بو کا تعلق ہے جو نامیاتی ہے جو پھلوں اور موسموں سے نکلتا ہے یہ ہر زمین کا اپنا ہے کوئی دوسری زمین اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔

سوال: آپ نے اظہار کے لیے کون کون سے شعبے اختیار کیے ہیں؟

جواب: عرض کیا ہے کہ آدمی کے پاس وقت کم ہوتا ہے جو کئی مسائل میں ضائع بھی ہو جاتا ہے میری طبیعت میں ہمہ نوعی ہے کہ میں ایک راستے پر نہیں چل سکتا میں جب دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی ایک راستے پر چلتا رہا ہے یا ایک عورت کا وفادار رہا ہے تو میرا جسم لرز جاتا ہے (قہقہے) میں سوچتا ہوں کہ کیا دنیا میں ایسے احمقانہ فعل بھی ہو سکتے ہیں (قہقہے) اس لیے میں بعض اوقات وفاداری جس کا مشرقی شاعری میں چرچا ہے کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا ذہن پھٹنے کو آتا ہے میں اسے قدیم جاہلانہ قبائلی صفت تصور کرتا ہوں۔خیر میرے نزدیک تنوع بنیادی چیز ہے کیونکہ زندگی اپنے آپ کو تنوعات میں منکشف کرتی ہے اگر تنوع نہ ہو تو زندگی کا انکشاف ختم ہو جائے اگر انکشاف نہیں تو موت ہے۔میں کہہ رہا تھا کہ تنوع میری بنیادی صفت ہے تو میں چاروں طرف ہاتھ مارتا ہوں وہ چاہے سارے ناکام ہو جائیں لیکن مجھے اسی حوالے سے خوشی ہوتی ہے قلعہ کی چھت پر کھڑے جنرل کو ہار جیت کا علم نہیں ہوتا مگر وہ یہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ اس کا کون سا سپاہی کیسے لڑ رہا ہے سو میں کامیابی و ناکامی کو نہیں دیکھتا۔میرے اندر بے پایاں قسم کی خواہشِ انکشاف ہے۔ولیم جیمز کہتا ہے کہ انسان بے پناہ ہے سو میرے خیال میں انسان کو بے پناہ ہونا چاہیے۔مصوری سے میرا آغاز ہوا۔ہم ریلوے کوارٹرز میں رہتے تھے۔میرے والد صاحب ریلوے سے متعلق تھے۔اس ماحول نے مجھے بہت متاثر کیا اب بھی کسی انجن کی سیٹی ہو یا ریلوے کے اوبزرویشن کیبن، حتیٰ کہ ایک ریل کا ڈبہ یا معمولی جنگلہ یہ سب میرے لیے بصیرت آفریں ہیں دیکھ کر میں خوش ہو جاتا ہوں کیونکہ ان سے میرے فنون کا تعلق ہے سو میرا آغاز مصوری سے ہوتا ہے۔

سوال: کسے دیکھ کر آپ میں شوق پیدا ہوا؟

جواب: ہم ریلوے روڈ پر رہتے تھے تو ہمارے ہمسائے میں میرے ایک دوست تھے عمر میں وہ بڑے تھے اور آرٹ ورک کرتے تھے۔پانچویں جماعت میں پائلٹ سکول میں پڑھا کرتا تھا۔میرے اس دوست نے ٹیگور کی تصویر بنائی، ٹیگور کے چہرے میں مجھے بے پناہ کشش محسوس ہوئی۔اتفاق سے انہی دنوں گیتا نجلی کا ترجمہ ہوا جو اس وقت تو سمجھ میں نہیں آیا مگر آج میں اسے سمجھتا ہوں۔تو میں کہہ رہا تھا کہ اس دور میں موسم بہت اچھے ہوتے تھے ہر روز مختلف رنگوں کی آندھیاں آتی تھیں مگر اب موسم بہت فلیٹ ہو گئے ہیں۔ہمارے مکان کے سامنے سڑک تھی جس کے رنگ بھی بدلتے رہتے تھے کبھی بجری اور کبھی سرخ روڑوں کے سبب بہت اچھی لگتی تھی اس کے آگے فٹ پاتھ سا تھا اس میں کچھ پودے تھے اور ان پر نارنجی رنگ کی تتلیاں اڑا کرتی تھیں نیچے کچھ کھیرے کے کھیت تھے آگے بیریوں کے جھنڈ اور اس سے آگے ریلوے لائن تھی۔صبح دوپہر شام ریلوے ٹریفک گزرتی تھی میں اپنے

سلیپنگ روم میں سویا ہوتا تو گاڑی کے گزرنے سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک اور چیز مجھے متاثر کرتی تھی کہ کمرے میں لیٹیلیٹے باہر سڑک پر گزرنے والے تانگے کی آواز بھی بدلتی رہتی تھی جب زمین گیلی ہوتی تو اس کی آواز مختلف ہوتی۔ بارش کے سبب زمین گیلی ہو جاتی پھر تیز ہوا کے ذریعہ بادل غائب ہو جاتے اور ہر طرف چاندنی پھیل جاتی، اس وقت کونجوں کا قافلہ آسمان سے گزرتا تو ان کی آوازیں مجھے متاثر کرتیں اور میں نجانے کیوں فرض کر لیتا کہ یہ کونجیں دریائے چناب کی طرف جا رہی ہیں۔ ملتان کے بارے میں گردوگرما گداو گورستان کو اس کی پہچان کہا جاتا ہے میں شروع سے اس خیال کے مخالف رہا ہوں میرے خیال میں اس میں تاریک پہلو کو دیکھا ہے مگر روشنی کو نشان زد نہیں کیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ روشنی کی تعریف کرو پرچھایوں کی بات مت کرو، ملتان کی روشنی کو بیان کرنا چاہیے تھا۔

سوال: کیا آپ نے اس کی باقاعدہ تربیت بھی حاصل کی۔

جواب: یہ اپنے طور پر ایک علمی سوال ہے عرض یہ ہے کہ دنیا میں بڑے مصوروں کی دو اقسام ہیں ایک تو امی ہیں ان کو یورپ والے ماقبلیاتی بھی کہتے ہیں ایک مکتبی ہیں۔ اور پہلا سوال وہاں یہی ہے کہ کیا آرٹ کی تدریس ممکن ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے اگر ہم کہیں کہ غالب، اقبال، میر، سودا، فراق وغیرہ جو بڑے شاعر ہیں انہیں یونیورسٹیوں کے ذریعے پیدا کیا جائے تو ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ تدریس غالب نہیں پیدا کر سکتی غالب تدریس پیدا کر سکتا ہے۔

سوال: آپ اپنے آپ کو مصوروں کے کس گروہ میں شامل کرتے ہیں۔ کیا آپ خود مکتبی ہیں یا۔۔۔؟

جواب: جی نہیں میں پوری طرح خود مکتبی نہیں ہوں اگر ایسا ہوتا تو میرے لیے اعزاز ہوتا لیکن میں آدھا ضائع ہو چکا ہوں۔ دیکھیں میں حضرت محمد ﷺ کو بہترین انسان سمجھتا ہوں کہ ان میں ہمہ نوعی ہے ان کا اخلاق مکمل ہے وہ امی ہیں مگر جو بات کرتے ہیں وہ عالمانہ ہوتی ہے۔

سوال: آپ نے آرٹ کی تعلیم کہاں حاصل کی؟

جواب: وہ ایسا ہوا کہ میں انڈسٹریز میں کام کرتا تھا یہاں ڈائریکٹر آف انڈسٹری تھے قریشی صاحب وہ جب ملتان آئے تو میری ان سے ملاقات ہوئی وہ متاثر ہوئے اور انہوں نے مجھے لاہور بھیج دیا انہوں نے کہا کہ بلاشبہ آپ اچھے آرٹسٹ ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ کسی ادارے کے ذریعے آپ کے فن کو پالش ہونا چاہیے انہوں نے میری کافی مدد کی اور دو اداروں میں فنی ٹریننگ دلوائی ایک میو سکول آف آرٹ لاہور یہ موجودہ این سی اے ہے اور ایک شاہدرہ میں ہے کیلی کوٹنگ سکول۔ تقسیم کے بعد آرٹ کے صرف یہی دو ادارے ہمارے حصے میں آئے تھے۔ انڈیا میں سر جے جے سکول آف آرٹ تھا ممبئی میں کیونکہ لاہور میں وہ ادارہ قریشی صاحب کے ماتحت ہوا کرتا تھا سو میں نے وہاں ٹریننگ حاصل کی۔ مگر مجھے وہاں سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ لیکن باقاعدہ طور پر شیخ احمد جو مسز انا مولکا احمد کے خاوند تھے مصوری میں میرے واحد استاد تھے کیونکہ وہ اس وقت پرنسپل تھے جو امریکہ سے آئے تھے مجھے انہی کے حوالے کیا گیا انڈسٹریز ڈیپارٹمنٹ کی طرف تھے۔

سوال: زوار صاحب اس دور میں بڑے بڑے نام تھے چغتائی، صادقین گل جی شاکر علی وغیرہ۔

جواب: اس وقت جو ماحول ہے اب کوئی عظیم شخصیت نہیں ہے۔ اس وقت کے لاہور کا ماحول مرعوب کن

تھا مثلاً میں آپ کو بتاؤں انہی دنوں چغتائی کی آمد و رفت بھی ہوا کرتی تھی۔ انہی دنوں پٹیالہ سٹیٹ آرٹس کہ جس نے ہندو میتھالوجی اور پنجابی زندگی پر بے نظیر کام کیا استاد اللہ بخش بھی تھے یہ دیوتا قسم کے انسان تھے۔ انڈیا کے ماحول میں بھی کئی مصور تھے ٹیگور تھے، رابندر ناتھ ٹیگور، جمنی رائے اور امرتا شیر گل یہ آدھی ہنگری کی تھیں اور آدھی سکھ تھیں اور نہایت خوبصورت تھیں اور انہیں آرٹ کی پرنسس کہا جاتا تھا انہوں نے مال روڈ لاہور پر جو پہلے نہایت خوبصورت ہوا کرتی تھی اور اب وہ آلودگی زدہ ہے ایک چھوٹا سا اسٹوڈیو قائم کیا۔ ہمارے دوست عابد علی عابد جو صاحب علم تھے ان پر فریفتہ تھے اور غزل میں اس کا ذکر بھی کیا۔

دور اک بے آسرا سا دیپ جلتا دیکھ کر
ہم کو اپنی کامناؤں کی چتا یاد آ گئی

اسی غزل میں غالباً وہ کہتا ہے کہ

اس بھرے نینوں کی امرتا یاد آ گئی

سوال: زوار صاحب آپ نے درخت کا میڈیم کیوں چنا اس کا کیا پس منظر بنتا ہے؟

جواب: درخت کے حوالے سے تو ایک الگ نشست کی ضرورت ہے یہاں آپ شعر و ادب کی بات کریں۔ درخت تو ایک مکمل فلاسفی ہے۔

سوال: زوار صاحب اپنی آنے والی کتابوں کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔

جواب: ایک تو اکیلی ہوا جو ابھی شائع ہوئی ہے اس میں بیس سال پہلے کا کام ہے۔ اس عمر میں جب بیماری بڑھ گئی اور دیکھا دنیا فنا کی نگری ہے (مسکراتے ہوئے) تو سوچا کہ جو کام کیا ہے اسے سامنے لایا جائے پھر تہذیب کے حوالے سے کام کیا ہے۔ اس کے بعد ایک کتاب شاعری کی ہے۔ پھر مصورانہ تنقید پر ایک مکمل کتاب ہے، یہ میری پوری زندگی کا کام ہے۔ پھر علمی موضوعات پر بھی کچھ کام کیا ہوا ہے۔

❋ ❋ ❋

ناصر عباس نیّر

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید نگاری پر چند خیالات

ڈاکٹر محمد علی صدیقی اُردو کے ممتاز نقاد ہیں۔ گزشتہ رُبع صدی سے ان کی آواز ترقی پسند حلقے میں معتبر اور محترم تو ہے ہی، ''غیر ترقی پسند'' تنقیدی حلقوں میں بھی ان کے افکار کو سنجیدگی سے لیا جاتا اور ان کی رائے کو اہم گردانا جاتا ہے۔

محمد علی صدیقی کی تنقید وسیع مطالعے اور گہرے تفکر کا ماحصل ہے۔ ان کے مطالعے کا تناظر سیاست، تاریخ، سماجیات اور لسانیات سے مرتب ہوا ہے۔ وہ ان علوم کی بنیادی بصیرتوں میں نہ صرف دستگاہ رکھتے ہیں بلکہ ان میں ہونے والی تازہ پیش رفت سے بھی برابر آگاہ رہے ہیں۔ ان کا تنقیدی عمل دراصل ادب پارے کا پس منظری اور تناظری مطالعہ ہے اور یہ پس منظر اور تناظر مندرجہ صدر علوم (جو سائنس کی معروضیت کے حامل ہیں) اور ان کے امتزاج سے عبارت ہے۔ وہ ادب پارے کے سماجی مضمرات اور سیاسی مطالب کو بطور خاص اہمیت دیتے ہیں۔ زبان کے مطالعے میں بھی وہ سماجی ساختوں اور سیاسی فلسفوں کی دریافت پر زور دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا طرزِ فکر ترقی پسندی سے مستیز ہوا ہے اور ترقی پسندانہ آئیڈیالوجی کسی سماجی مظہر کو خود مکتفی اور الگ تھلگ قرار نہیں دیتی۔ اس آئیڈیالوجی کی رُو سے سیاست، مذہب، اور فنون لطیفہ کسی سماج کی بالائی ساخت (SuperStructure) ہیں جو ایک بنیادی ساخت (Infra Structure) پر استوار ہے۔ انفراسٹرکچر معاشی سماجی ڈھانچہ ہے اور دونوں ساختوں میں براہ راست رشتہ ہے۔ چنانچہ معاشی ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلی سیاسی، مذہبی اور ادبی رویوں کو لازماً متاثر کرتی ہے، لہٰذا سماج کی بالائی ساختوں کا مطالعہ و تجزیہ بنیادی ساخت کو ملحوظ رکھے بغیر ممکن نہیں۔ مارکسی آئیڈیالوجی کے اس تصور کو قبول کرنے کی بنا پر تمام ترقی پسند ناقدین (بشمول محمد علی صدیقی) ادب کے پس منظری مطالعے پر زور دیتے ہیں۔

محمد علی صدیقی کی تنقید میں ایک مستحکم تاریخی شعور برابر کارفرما رہتا ہے۔ اس تاریخی شعور کا مرکزِ ثقل برصغیر سمیت تیسری دُنیا کی معاشی، سیاسی، صنعتی، تعلیمی اور فکری صورتحال ہے۔ بلاشبہ یہ صورتِ حال ناگفتہ بہ ہے اور اس کا باعث (ان کے نزدیک) وہ سرمایہ دارانہ سماجی نظام ہے جس کی زد میں یہ ممالک براہِ راست یا بالواسطہ رہے ہیں۔ اس تاریخی شعور میں کسی حد تک ادعائیت ہے۔ غالباً اس لیے کہ انہیں ہر جگہ اور ہر زمانے میں سامراجیت کے ہتھکنڈے یکساں نظر آتے ہیں۔ تاہم ان کا سماجی شعور تغیر کو لازم گردانتا ہے (تاریخی مادیت کے زیر اثر)۔ وہ یہ اُمید رکھتے ہیں کہ مسلسل مساعی نہ صرف صورتِ حال کو انجام کار بدل دیتی ہے بلکہ یہ مساعی جس مقصد اور سمت کے جس شعور سے متحرک ہوتی ہے، وہی تبدیلی کا رُخ بھی متعین کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی ارادہ کسی بھی صورتِ حال کو جنم دیتا یا ختم کرتا ہے اور اگر اب تک صورتِ حال نہیں بدلی تو اس نقطۂ نظر کی رُو سے اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو انسانی جدوجہد کی رفتار کم ہے یا وسیع سماجی شرکت بہ جدوجہد محروم ہے یا پھر سمت و مقصد کا واضح شعور اس جدوجہد کی پشت پر نہیں ہے۔ محمد علی صدیقی کی تنقید عمومی ادبی و جمالیاتی اہداف سر کرنے کے

بجائے زیادہ مقصد و سمت کے مخصوص شعور کی فروغ و اشاعت میں زیادہ سرگرم دکھائی دیتی ہے تاکہ صورتِ حال تبدیل ہو۔ جمالیاتی اہداف کو اپنے تنقیدی عمل کے سیدھے نشانے پر نہ رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ادب کی ادبیت کے ہی منکر ہوں۔ نہیں۔ وہ اس کے قائل ہیں مگر ان کے ہاں ادبیت کا مفہوم مختلف قسم کا ہے اور یہ مفہوم مارکسی تھیوری سے پوری طرح ہم آہنگ ہے یعنی وہ جمالیاتی مسرت کو ادب کا بنیادی (اور آخری) وظیفہ قرار دینے کے بجائے اسے ادب کا محض ایک ثانوی پہلو مانتے ہیں اور اسے ادب کی ایک ایسی قوت قرار دیتے ہیں، جو سماجی مقاصد کے حصول میں معاون ہوتی ہے۔ اُن کے اپنے لفظوں میں:

> ''میرا تعلق ایک ایسے فکری میلان سے ہے جو زندگی کے بارے میں کسی منصوبہ بندی میں تو شریک نہیں ہے لیکن اچھی یا بری تبدیلیوں کی سچی عکاسی ہی کو فن گردانتا ہے۔ اس شعبہ کا ایک ذیلی کام یہ بھی ہے کہ عکاسی کی تنقیح اور اگر ضروری ہو تو اس پر تنقید کی جائے۔''
>
> (''مضامین''۔ ص ۸۰)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ وہ فن کے الہامی اور اظہاری نظریات میں یقین نہیں رکھتے بلکہ ادب کو سماجی تبدیلیوں کا آئینہ سمجھتے ہیں۔ فن کا الہامی نظریہ فن کو موجود اور معلوم حقیقتوں کی ترجمانی تک محدود نہیں سمجھتا، بلکہ ناموجود اور نامعلوم سے اپنے رشتے میں بھی اعتقاد رکھتا ہے۔ اس نظریے کے حامل فنکار کا تخلیقی شعور سماجی سطح سے آگے کائناتی سطح کو بھی مَس کرتا ہے اور متعدد ایسے سروکاروں کو ٹٹولا دیتا ہے جو روزمرہ کی زندگی سے بظاہر غیر متعلق ہوتے ہیں۔ ترقی پسند اور دیگر اصلاحی ادب کے مویدان سروکاروں کو بورژوا ذہنی تعیش کا نام دیتے ہیں اور انہیں فنکار کی سماجی علیحدگی کا نتیجہ بھی ٹھہراتے ہیں۔ اگر ادب کو سماجی شعور اور سماجی شعور کو مادی حالات سے لازماً منتج کیا جائے گا تو فن کے الہامی اور اظہاری نظریات پر اس نوع کے اعتراضات لابدی ہیں۔

محمد علی صدیقی جب ادب کو سماجی تبدیلیوں کی عکاسی پر مامور کرتے ہیں تو فنکار پر یہ ذمہ داری بھی عائد کرتے ہیں کہ وہ سچی عکاسی کرے اور ادب کے ''ذیلی شعبے تنقید'' کو یہ فریضہ سونپتے ہیں کہ وہ عکاسی کے سچے یا باطل ہونے پر نظر رکھے۔ گویا وہ تخلیق پر تنقید (جو سماجی اور تاریخی شعور سے بہرہ ور ہو) کو نگراں رکھنے اور اس سے تخلیق کی سمت نمائی کا کام لینے کے قائل ہیں۔ مارکسی نقاد عکاسی کے حقیقی یا باطل ہونے سے مراد بالعموم اس کا رجائی ہونا لیتے ہیں۔ ایک مارکسی کی نظر میں وہ ادب معاشرے کا سچا عکاس نہیں، جو مایوسی، بے زاری، تنہائی، افسردگی اور بے معنویت کے مضامین سے عبارت ہو۔ اُس کے نزدیک فنکار سماج کا ایک منفعل ترجمان نہیں بلکہ وہ سماجی تبدیلیوں کو مثبت اور ارتقائی رُخ دینے والی ذمہ دار اور فعال ہستی ہے۔ تاریخی مادیت ایک مارکسی کو یہ باور کراتی ہے کہ تاریخ کا عمل انسانی ارادے سے خالی نہیں۔ انسانی ارادے کی لاٹھی سے تاریخ کی جہت بدلی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مارکسیت کی رُو سے اگر معاشرے میں بے زاری، افسردگی اور مایوسیت پیدا کرنے والے حالات موجود بھی ہوں تو ان کی عکاسی، حقیقی نہیں ہوگی۔ حقیقی عکاسی، وہ ہوگی جو ان حالات کے تجزیے کے بعد ان حالات کو بدلنے پر قادر ایک رجائی لائحہ عمل پر مبنی ہوگی۔ سوشلسٹ حقیقت نگاری نے یہی نقطہ نظر اختیار کیا تھا اور جب اس نقطۂ نظر میں ایک بڑی سیاسی قوت کے پس پشت ہونے کی بنا پر ادعائیت پیدا ہوگئی تھی تو تمام ادبا کے لیے یہ بات شاہی

فرمان کا درجہ اختیار کر گئی تھی کہ وہ بہر طور رجائی زاویہ نظر اختیار کریں۔ یہیں مارکسیت میں تناقض بھی پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ تھیوری حقیقت نگاری کو اپنا بنیادی اصول قرار دیتی ہے اور دوسری طرف بہر طور رجائی زاویہ نظر اختیار کر کے ''حقیقی مادی حالات'' (جو بے زاری اور اجنبیت پیدا کرتے ہیں) کی عکاسی سے گریز بھی کرتی ہے اور مثالیت پسندی کا شکار ہوتی ہے۔

محمد علی صدیقی کے ہاں نظریے کی بوجھل تکرار اور اُکتا دینے والی اشتہاریت نہیں۔ وہ مسائل کے تجزیے میں اور ان کے حل کے طور پر مارکسی تھیوری کو بروئے کار تو لاتے ہیں مگر اپنے تنقیدی عمل کو توازن اور اعتدال کا پابند بھی بناتے ہیں۔ بنابریں انہوں نے سکہ بند ترقی پسند اُدبا کے ساتھ ساتھ جدیدیت پسندوں کے مطالعات بھی پیش کیے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنے حلقے کے تخلیق کاروں کی ستائش میں کہیں کہیں غلو سے کام لیتے ہیں (مثلاً فیض اور فراز کے سلسلے میں) تاہم وہ ترقی پسند کیمپ سے باہر فنکاروں کی تحسین فن میں اپنے نظریے کو مزاحم نہیں ہونے دیتے۔

غالب کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''شاید بڑے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اردگرد کے حالات کے بارے میں غافل اور ماورائے احساس وفوق الفطری سچائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔'' (''مضامین''۔ص ۱۷۶)

بظاہر اس رائے میں غالب کی بڑائی پر طنز کیا گیا ہے مگر اس رائے کو محمد علی صدیقی کی جملہ تنقیدات کے تناظر میں رکھ کر پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ''ماورائے احساس اور فوق الفطری سچائیوں'' کو مانتے ہیں بلکہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سچائیاں بڑی شاعری کی تخلیق کا موجب بھی بنتی ہیں۔ یوں وہ دیگر ترقی پسندوں کی مانند اس انتہا پسندانہ فکر کے حامل نہیں کہ واحد سچائی اردگرد کے مادی ومعاشی حالات نہیں۔ محمد علی صدیقی کی تحریروں میں اس ایقان کا اظہار بار بار ہوا ہے کہ انسانیت کی سب سے بڑی قدر (اور ضرورت) علم ہے اور علم جس تجسس کا ثمر ہے، وہ مادہ اور ماورائے مادہ دونوں قسم کے حقائق کا تعاقب کرتا ہے۔ محمد علی صدیقی کی فکر میں توازن کا ایک اور سبب بھی ہے۔ ہمارے ہاں مارکسی فکر کے بیشتر مقلدوں نے مشرق کی روایت (جو مابعد الطبیعات پر استوار ہے) کو مسترد کیا ہے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے حقیقت کی اُس مادی تعبیر کی پیروی کی ہے، جسے مغرب کے آرتھوڈاکس مارکسی فلاسفہ نے پیش کیا ہے جب کہ محمد علی صدیقی نے مشرق کی مذہبی اور صوفیانہ فکر سے اپنا ذہنی رشتہ برقرار رکھا ہے اور اس طرح حقیقت کے ایک ہمہ گیر تصور کو قبول کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مارکسی معتقدات کی قبولیت کے جوش میں اُس روایت سے منقطع نہیں ہوئے، جس پر ان کی ثقافتی شناخت کا انحصار ہے۔

محمد علی صدیقی ایک مستحکم تنقیدی موقف کے حامل تو ہیں مگر انہیں اپنے موقف کی حتمیت پر اصرار نہیں۔ ''نشانات'' کے ابتدائیے میں رقم طراز ہیں:

> ''۔۔۔نشانات کے مضامین میں جاری وساری سچ کو لمحۂ موجود کی صرف ایک تاویل قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ ''سچ'' کی ہزاروں تاویلیں، اپنے

> جلو میں بڑی گہما گہمی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان مضامین کا ''سچ'' ہی واحد سچ ہے۔'' (ص ۹)

اپنے سچ کو اضافی ماننا، اپنے سچ کے ضمن میں کسی تشکیک کی وجہ سے نہیں بلکہ اس عاجزی کی وجہ سے ہے جس کے بغیر کوئی علمی وفکری نصب العین حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی خالص علمی ضابطۂ اخلاق ہے اور اسی پر عمل پیرا ہو کر دوسرے مکاتبِ فکر کے ساتھ ڈسکورس جاری رکھا جا سکتا ہے جو نظریہ واحد اور مطلق حقیقت کے طور پر خود کو بہر طور منوانے کی راہ پر چلتا ہے۔ وہ علم وفکر کی ترقی میں سنگِ گراں ثابت ہوتا ہے۔ اس ضمن میں محمد علی صدیقی کے یہ خیالات اہم ہیں:

> ''نئے ادب اور نئی تنقید کا اولیں مقصد جمہوری بلکہ حقیقی جمہوری معاشرہ کے قیام میں حتی المقدور معاونت ہونا چاہیے۔'' (نشانات، ص ۱۷)
>
> ''اگر ہمارا ملک ایک جمہوری معاشرہ بننا چاہتا ہے تو ہمیں ادب کے ہمہ جہتی مطالعے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔'' (نشانات، ص ۱۲)

ظاہر ہے اگر تنقید کو جمہوری معاشرے کے قیام میں معاون ہونا ہے تو اسے ایک ہمہ جہت ڈسکورس بننا ہوگا، اپنی حدود کو پھیلانا اور ہر مکتب فکر (ونقد) کی آواز اور رائے کو برابر مرتبہ اور احترام دینا ہوگا۔ نیز ادب کے ہم جہت مطالعے کے لیے ہر سمت سے اُس پر روشنی ڈالنا ہوگی تا کہ متن میں مضمر ہر نوع کے سروکاروں کو منظر عام پر لایا جا سکے۔ اس کے لیے ایک سے زائد تنقیدی نظریات اور حربوں کو آزمانے کی ضرورت ہوگی۔ (اور ایک جمہوری معاشرے میں ہی مختلف اور متعدد نظریات پنپ سکتے ہیں)۔ یہ تنقیدی رویہ جس امتزاجیت اور عدم مطلقیت سے عبارت ہے، مابعد جدید تنقید میں اسے خصوصی اہمیت ملی ہے۔ ان دنوں مابعد جدیدیت اردو میں زیر بحث ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس نئے تنقیدی مبحث کا اردو میں آغاز محمد علی صدیقی نے ۱۹۷۶ء میں ساختیاتی لسانیات پر اپنے سلسلۂ مضامین سے کیا تھا جو ''اوراق'' میں چھپے تھے۔ ان مضامین میں ساختیات کو ترقی پسندانہ زاویے سے جانچا گیا تھا۔ چونکہ ساختیات اور ترقی پسندی (کی آرتھوڈاکس تعبیر) میں کئی مقامات پر ٹکراؤ کی صورت موجود تھی، اس لیے محمد علی صدیقی نے اسے ردّ کیا۔ ساختیاتی لسانیات پر ان کے چند اہم اعتراضات یہ تھے:

i۔ ساختیات زبان کے غیر تاریخی/ یک زمانی (Synchronic) مطالعے کی موید ہے۔ یوں یہ ''جمودی'' نقطۂ نظر کی حامی ہے۔

ii۔ ساختیات ہمیں غیر ضروری طور پر وجود پاتی (Ontological) مباحث میں الجھاتی ہے ___ اس نے ایک ایسا مذہب تیار کیا ہے جو انہیں چیزوں کی شیئیت میں الجھا کر خود چیزوں سے الگ تھلگ کر دیتا ہے۔

iii۔ یہ سسٹم نظریۂ تاریخ، جدلیت اور سائنسی پیش گوئی کے خیالات پر ضرب لگاتا ہے۔

ترقی پسندانہ فکر چونکہ ہر نظریے کو اس کے تاریخی پس منظر کے حوالے سے جانچتی ہے اور یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ ہر نظریہ لازماً سیاسی معانی اور مقاصد کا حامل ہوتا ہے، اس لیے محمد علی صدیقی ساختیات (اور مابعد جدیدیت) کو عالمی سیاسی نظام کا ایک ایسا حربہ خیال کرتے ہیں، جو پسماندہ اقوام کو بعض ''غیر ضروری'' مسائل میں الجھا کر ضروری اور بنیادی مسائل سے صرفِ نظر کرنا سکھاتا ہے۔ محمد علی صدیقی کے اس نقطۂ نظر سے ان کی انسان

دوستی مترشح ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ساختیات انہی معانی (اور مضمرات) میں محدود و محصور ہے جو محمد علی صدیقی نے بیان کیے ہیں؟ اصل یہ ہے کہ محمد علی صدیقی نے ساختیات کا مطالعہ مخصوص ذہنی پس منظر اور فکری تحفظات کے ساتھ کیا ہے وہ عام طور پر مارکسی تنقیدی تھیوری کی کلاسیکی تعبیرات پر بھروسا کرتے ہیں۔ مغرب میں یہ تعبیرات مارکس اور اینگلز کی فکر کی بنیاد پر ٹراٹسکی، کرسٹوفر کاڈویل اور جارج لوکاچ وغیرہ نے پیش کی ہیں۔ کلاسیکی مارکسیست اپنے تصورات کی حتمیت میں اعتقاد رکھتی ہے اس لیے یہ ان تصورات پر نظر ثانی اور انہیں دیگر نظریات کے ساتھ ملا کر پڑھنے کی ضرورت سے بے نیاز ہے۔ مغرب میں اب کلاسیکی مارکسیت کی جگہ نو مارکسیت نے لے لی ہے۔ اور نو مارکسیت کا امتیاز ہی یہ ہے کہ اس نے خود کو دوسرے، معاصر نظریات کے تناظر میں رکھا اور اپنا جائزہ لیا ہے اور معاصر نظریات میں ساختیات و پس ساختیات بھی شامل ہیں۔ تھیوڈوراڈورنو، بریخت، گولڈمان، لوئی آلتھیوسے، پیٹر ماسٹرے، فریڈرک جیمی سن، ٹیری ایگلٹن نو مارکسی نقاد اور فلسفی ہیں۔ کلاسیکی مارکسیت اور نو مارکسیت میں ایک اور بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر ادب کو سراسر سماجی معاشی حقیقت کا عکاس سمجھتی ہے۔ سپر سٹرکچر اور اساس (Base) میں براہِ راست رشتے کی قائل ہے، جبکہ نو مارکسیت ادب کی اضافی اور محدود خودمختاری کو تسلیم کرتی ہے۔ نیز ادبی متن کو آئیڈیالوجی کا سیدھا اور سچا عکاس قرار دینے کی بجائے دونوں میں فصل اور تناؤ دیکھتی ہے۔ یوں نہ صرف متن سے باہر کی آئیڈیالوجی اور متن میں مضمر آئیڈیالوجی میں فرق کرتی ہے بلکہ آئیڈیالوجی کو محدود سیاسی مفہوم میں مقید رکھنے کی بجائے اسے وسیع انسانی تجربے سے منسلک بھی کرتی ہے۔☆ مارکسیت کی یہ بلند فکری سطح بلاشبہ ساختیات و پس ساختیات کی بصیرتوں سے اخذ و استفادے کا ثمر ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں ان نظریات کو ترقی پسندوں نے ردّ کیا اس لیے نہ تو خود مارکسیت کی تعبیرِ نو کر سکے نہ مغرب کے نو مارکسیوں سے استفادہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مارکسی نقاد آج بھی وہی باتیں دہرائے چلے جا رہے ہیں جو نصف صدی بیشتر کہی گئی تھیں اور جو آج کی دانشورانہ علمی فضا کے لیے یا تو اجنبی ہیں یا ازکار رفتہ! بایں ہمہ محمد علی صدیقی کے نقطۂ نظر کے سلسلے میں یہ دفاعی دلیل دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی فکری کاوشوں کو ایک ایسے سماج کی تعمیر میں صرف کرنا چاہتے ہیں جو سائنسی عقلیت پسندی کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی اور معاشی مساوات سے متصف ہو۔ ان کے نزدیک مذکورہ اوصاف سے محروم معاشرہ پیچیدہ علمی اور فلسفیانہ مباحث کی ''عیاشی'' کا متحمل نہیں ہوتا۔ تاہم محمد علی صدیقی اصولی طور پر خالص علم کی جستجو کو انسانیت کی اولین قدر تسلیم کرتے ہیں۔

ترقی پسندی کا ''اینٹی تھیسس'' جدیدیت ہے۔ مغرب (بالخصوص جارج لوکاچ) اور اردو کے ترقی پسند ادبا جدیدیت کو زوال پسندی سے تعبیر کرتے ہیں اور مارکسیت کو ترقی پسندی کا نام دیتے ہیں۔ محمد علی صدیقی بھی جدیدیوں کی انفرادیت پرستی، تنہائی، داخلیت پسندی وغیرہ کی مورِدِ طعن بناتے ہیں اور ان روشوں کو سماجی عمل سے گریز کا نام دیتے ہیں اور انہیں رجعت پسند استعماری عزائم کے حامل سیاسی فلسفے سے منسلک گردانتے ہیں۔ محمد علی صدیقی جب جدیدیت کی فکری کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں تو غالباً کا مقصد مارکسیت کے نظریاتی امتیاز کو اجاگر کرنا ہے اور جب وہ جدیدیت پسندوں کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں تو ان کے پیشِ نظر بعض جدیدیوں کی انتہا

☆ نو مارکسیت کے تفصیلی مطالعہ کے لئے راقم کا مقالہ ''مارکسی تنقید کے تین دور'' مطبوعہ ''مکالمہ'' (کراچی) کے شمارہ نمبر ۹ میں ملاحظہ کیجئے۔

پسندانہ روشیں ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ دوسری طاقت کچھ ایسے لایعنیوں اور نراجیوں کی منفی آوازوں سے عبارت رہی ہے۔ جو جدیدیت کے نام پر ہماری قومی اور بین الاقوامی زندگی کے درمیان ارتباط ختم کرنے کے علاوہ قومی وجود کو ہلاکت و فلاکت کے سپرد کرنا چاہتے ہیں، وہ اس طرح کہ ان لوگوں کے ہاں ہیئت کے حق میں متشدد عصبیت کے علاوہ خود شاعری اور زندگی کے خلاف اس قدر غلو آمیز تعصّبات ہیں کہ جب ہم ان حضرات کی تحریروں میں ادب کی خودمختاری، تخلیقی عمل کی سائنس بیزاری اور فرد کی تنہائی جیسے مسائل کو سب سے محکم داعیوں کے روپ میں دیکھتے ہیں تو پھر صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ادب اور زندگی کو سبوتاژ کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کیا ہتھیار ہو سکتے ہیں۔'' (''نشانات''۔ ص ۸۴)

اہم بات یہ ہے کہ محمد علی صدیقی اُس جدیدیت کے مخالف نہیں ہیں جو عقلیت اور سائنسی ترقی کی موید ہے۔ وہ برملا کہتے ہیں:

> ''میرا خیال ہے کہ جدید ہونے کا دعویٰ صرف وہی ادیب کر سکتا ہے جو سائنسی اکتشافات اور تقاضوں پر برہم ہونے کی بجائے ان سے کھلے دل و دماغ کے ساتھ معاملت کرے۔'' (''نشانات۔ ص ۸۶)

قصہ یہ ہے کہ جدیدیت کی دو صورتیں نمایاں اور قابلِ امتیاز ہیں۔ ماڈرنیٹی اور ماڈرنزم۔ ماڈرنیٹی کا تعلق تمام علوم اور فکری منطقوں میں ظاہر ہونے والی جدید روشوں سے ہے اور ماڈرنزم ادب و فن کے جدید رویوں سے متعلق ہے۔ لہٰذا ایک کو ''ہمہ گیر جدیدیت'' اور دوسری کو ''جمالیاتی جدیدیت'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اردو میں سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک مزاجاً ماڈرنیٹی کی حامل تھیں۔ اسی لیے ان کا سروکار محض ادب اور فلسفۂ جمال نہیں تھا۔ محمد علی صدیقی بھی جس جدیدیت کی تائید پر مائل نظر آتے ہیں وہ ماڈرنیٹی ہے اور اس تائید کی وجہ اپنے خطے کی پسماندگی کا شعور ہے۔ اس شعور کو محمد علی صدیقی کی تنقیدی فکر کا مرکزہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جب وہ جدیدیت پسندوں کے ادب میں اجنبیت، تنہائی اور بے زاری کے موضوعات پر چوٹ کرتے ہیں تو ان کا استدلال ہے کہ ہمارے ہاں ابھی وہ سائنسی و صنعتی سماج محض ایک خواب ہے، جس میں تعلیم، صحت، روزگار کے مسائل نہیں ہوتے۔ فرد معاشی بے فکری اور جسمانی عیش پسندی سے اکتا کر اپنے اندر ایک بے زاری محسوس کرتا ہے۔ اس صورت میں اپنے ادب میں تنہائی اور معاشرتی گریز کے موضوعات کو پیش کرنا، ان کے نزدیک محض فیشن اور اپنی مٹی سے عدم انصاف کے برابر ہے۔ نیز ایک حقیقی صورتِ حال کے جواب میں غیر حقیقی ردِعمل ہے۔ محمد علی صدیقی کی اس رائے میں یقیناً وزن ہے اور اس میں ادب کو حقیقی زندگی سے وابستہ رہنے، ادب کو زندگی کی بدلنے والی قوت اور تہذیبی شناخت کا ذریعہ بنانے پر زور بجا طور پر موجود ہے۔ اور تہذیبی شناخت کی استواری ماضی کے ارتقا پذیر شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ اکثر ترقی پسندوں نے ماضی کو زیادہ تر جاگیردارانہ نظام کے مساوی سمجھ کر ردّ ہی نہیں کیا

،اس کی تضحیک بھی کی ہے۔مگر محمد علی صدیقی کے ہاں یہ انتہا پسندی نہیں ہے اور وہ ماضی کا ایک وسیع تصور رکھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر ہے کہ حال کی معنویت ماضی کے صحت مند اجزا کی فعال شرکت کی مرہون ہے اور ان صحت مند اجزا کی زندگی اس میں ہے کہ وہ تخلیقی مقبولیت کا مظاہرہ کریں۔صاف ظاہر ہے کہ وہ ماضی کے جس شعور کے حامل ہیں، اس میں وہ روایت بھی شامل ہے جو فکری تسلسل رکھنے کی وجہ سے کسی قوم کی ثقافتی شناخت کو ممکن بناتی ہے۔

محمد علی صدیقی معروضی سماجی وسیاسی صورتِ حال کے تجزیے میں گہری بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گو ان تجزیوں میں کہیں کہیں صحافیانہ عنصر در آتا ہے۔مگر مجموعی طور پر یہ تجزیے گہرے انفرادی تفکر اور تاریخی شعور کے مظہر ہوتے ہیں۔اپنے خطے کی سماجی وسیاسی صورتِ حال پر مرتکز رہنے کی وجہ سے وہ تخلیقی تجزیے کی ماہیت کے غائر تجزیے پر متوجہ ہو سکے ہیں نہ ادبی متن کی ساخت میں مضمر مختلف النوع سروکاروں کی نشاندہی پر مائل ہو سکے ہیں۔ ویسے وہ جس تنقیدی موقف کے علمبردار ہیں اگر اس کی حدود کی ملحوظ رکھیں تو اس قسم کے مطالبات اصولاً درست نہیں ہیں۔ ہر تخلیق کار اور نقاد کو اس کی تخلیقی وفکری حدود میں ہی زیرِ بحث لانا مناسب ہوتا ہے۔ بہر کیف محمد علی صدیقی ایک ایسے نقاد ہیں جس کا فکری تناظر قومی وعالمی مسائل، تاریخی وتہذیبی معاملات اور جدید سائنسی وعلمی ولسانی انکشافات کو محیط ہے، جس کے تجزیاتی طریق میں معروفیت، توازن اور جرات مندی بیک وقت موجود ہیں اور جن کا استنباطی عمل بالعموم زندگی کی کلیت کو ملحوظ رکھنے سے عبارت ہوتا ہے۔اس حوالے سے وہ احتشام حسین اور ممتاز حسین کے بعد ہم ترقی پسند نقاد تو ہیں ہی، اردو کے بھی ممتاز نقاد ہیں۔

❋ ❋ ❋

ڈاکٹر عصمت ناز

چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں کی علمی وادبی حالت سیاسی تناظر میں

مسلمانوں نے قرونِ اولیٰ میں ترقی اور عروج کی جو شاندار منازل طے کی تھیں اور انہیں جس طرح اوجِ کمال تک پہنچایا تھا وہ اس بات کی گواہ ہیں کہ مسلمانوں نے ہر میدان میں طبع آزمائی کی اور ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے تھے نت نئی فتوحات سے ان کی آنکھیں وا ہوئیں اور اس طرح تحقیق وتجربے کے نئے راستے بنتے چلے گئے اور مسلمان نہ صرف قابلِ تقلید ٹھہرے بلکہ ناقابلِ تسخیر بھی رہے مگر رفتہ رفتہ جب انہوں نے مرکز سے لاتعلقی اور انتشار پسندی اور دین سے دوری کو اپنایا تو ان کی حالت بدلتی چلی گئی اور یہ لوگ زوال کا شکار ہونے لگے مگر اس زوال پذیر دور میں بھی یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ علوم وفنون وادب کے میدان سرسبز رہے پھلتے پھولتے رہے۔درج ذیل میں اس صدی میں ہونے والی علمی وادبی ترقی کا جائزہ لیا جائے گا۔

چوتھی صدی ہجری کے ربع اول یعنی ۳۲۴ھ ۹۳۵ء میں عالم اسلام بہت سی ریاستوں میں منقسم ہو چکا تھا لگتا تھا کہ تسبیح کے دانے بکھر گئے ہوں یا پھر ایک ہی چشمے کی بہت سی شاخیں پھوٹ پڑی ہوں۔اگرچہ اس سے قبل خراسان مغرب (مراکش) شمالی افریقہ وغیرہ الگ ہو چکے تھے مگر اب اس طرح سے اور بھی زیادہ سیاسی تبدیلیاں آئی تھیں کہ ایک خاندان سے نکل کر دوسرے خاندان میں حکومت منتقل ہو جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں لگتا تھا یا آئے دن کی انقلابی تبدیلیوں نے لوگوں کے ذہنوں میں قبول کرنے کی اور چپ رہنے کی استعداد بڑھا دی تھی۔دیکھو اور خاموش رہو کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر سیاست سے جداگانہ انداز اپنائے علم وادب وصنعت وحرفت کے میدانوں میں یکسوئی سے کام کر رہے تھے۔اس دَور میں بغداد اتراک کے ظلم وستم کا شکار تھا، ایران میں اصفہان، رین اور جبل کا علاوہ بنو بویہ کے ہاتھوں میں تھا۔کرمان کے علاقے میں محمد بن ایاس، موصل میں دیار بن ربیعۃ ودیار بن بکر اور مصر کا علاقہ بنی حمدان اور مصر وشام پر محمد بن محمد بن طبع الاخشید اور مغرب اور افریقہ فاطمین کے قبضے میں تھے جب کہ انہی کا ہم عصر عبدالرحمٰن الناصر اندلس کا حکمران تھا۔خراساں میں نصر بن احمد السامانی، الاھواز، واسط اور بصرہ پر برید بن یمامہ، بحرین پر قرامطہ اور طبرستان اور بصرہ الدیلم کے پاس تھے۔اس طرح عباسیوں کی حکومت صرف بغداد تک ہی محدود نظر آتی تھی۔

لیکن بنو عباس نے بالخصوص ابو جعفر المنصور نے جس طرح سے عباسی خلافت کو تقدس کا رنگ بخشا تھا اور خلیفہ کو ظل اللہ کہا تھا اُس نے عوام کے ذہن میں یہ ثبت کر دیا تھا کہ ان کا عزت واحترام ہمارا فرض ہے اور خلافت انہی کے لیے ہے اطاعت انہی کے لیے ہے لہٰذا اس طرح سے سلطنت کے ایک بڑے حصے سے کروفر سے محروم ہو جانے کے بعد بھی یہ لوگ معزز ومحترم ٹھہرے حالانکہ دیگر علاقوں کے حکمران جو ان سے زیادہ بااختیار تھے وہ اطاعت کے واجب تھے مگر وہ لوگ بذاتِ خود ان سے حکومت وسلطنت کی رسمی اجازت لینے میں بھی فخر وانبساط

محسوس کیا کرتے تھے۔

دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مملکت اسلامیہ خواہ کوئی بھی ہو کہیں بھی ہو مسلمانوں کا وطن ہے۔ مسلمان جہاں بھی گئے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں یا ایک دربار سے کٹ کر دوسرے دربار سے منسلک ہوئے ان کی پذیرائی ہوئی۔ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ علماء ادباء محدثین، جغرافین بڑی آسانی سے ایک سے دوسرے علاقے میں جاتے جیسا کہ ابن بطوطہ، ابن جبیر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جنہوں نے بہت سے علاقے دیکھے اور بہت سے حکومتوں کی تبدیلیوں کو انہوں نے دیکھا اور ان کے ذریعے سے بہت نادر اور اہم معلومات لوگوں تک پہنچتی تھیں کیونکہ جگہ جگہ انتشار اور ٹوٹتی ہوئی حکومتوں اور خودمختار ریاستوں کا قیام لمحہ فکریہ تھا۔ یہ سیاسی ضعف کو ظاہر کرتا تھا۔

لیکن اس سیاسی کمزوری اور انحطاط کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ اِس دور میں مسلمانوں کی علمی و ادبی حالت بھی زوال کا شکار ہو رہی تھی بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس دور میں جس قدر ترقی علم و ادب کے میدان میں ہوئی پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں۔ اس میدان میں سیاست کے برعکس نہایت آسودگی اطمینان و روشن خیالی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک مرکز سے جدا ہونے والوں نے یا پھر الگ اور خودمختار ریاستیں وحکومتیں قائم کرنے والے ہر امیر اور حکمران نے اپنے اردگرد اپنے دربار میں علماء و ادباء کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا پھر اس طرح سے اس میدان میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں وہ علماء فضلاء کو زیادہ سے زیادہ مراعات وانعام واکرام اور وظائف سے بھی نوازرہے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ یہ علاقے جو کہ پہلے صوبہ جات یا مرکز کے زیرنگرانی کام کرتے تھے اور اپنا مال بطور ٹیکس مرکز کو بھجواتے تھے۔ اب یہ خودمختار تھے اور اپنا مال اپنی مرضی سے خرچ کر سکتے تھے لہٰذا علم و ادب کی ترقی کے لیے بھی رقوم خرچ کی جانے لگی تھیں۔

کیونکہ پہلے صرف مرکز میں یا مرکزی دربار میں رسائی پانے والے علماء و ادباء کو شہرت حاصل ہوتی تھی انہیں وظائف وغیرہ ملتے تھے لیکن اب پھر علاقے میں موجود اس طبقے پر لوگوں کی نظر پڑی اور انہیں آگے آنے کا موقع ملا اور انہیں اب براہِ راست اپنے اپنے حکمرانوں سے انعام واکرام ملنے لگے اور اس طرح سے مسابقت کا دَور شروع ہوگیا اور اس مسابقت نے علم و ادب کو فروغ دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ علم ہمیشہ مال سے متاثر ہوتا ہے یہ بات سچ ہو یا نہ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ درباروں سے وابستہ ہونے والے علماء نے اس دور میں اس معاشی آسودگی سے فائدہ مند ہو کر علم و ادب کی ترویج واشاعت کے لیے بے فکری سے کام کیا اور وہ شاعر یا ادیب یا مصنف جو کہ مرکز تک نہیں پہنچ سکتا تھا اس کے فن سے لوگ فیض یاب نہیں ہو پاتے تھے۔ اب ہر علاقے میں یہ لوگ جگمگانے لگے تھے۔ ان کی شہرت بہت جلد اپنے علاقے سے نکل کر دوسرے علاقوں تک پھیل جاتی تھی بلکہ ایسا بھی ہونے لگا کہ بغداد کے معروف و مصروف علماء و ادباء نے بغداد سے نکل کر اردگرد کے درباروں سے وابستہ ہونا شروع کر دیا جو کہ ان علاقوں کی علمی و ادبی ترقی کی گواہی تھی جیسا کہ عبدالوہاب المالکی، ابونواس اور ابوتمام وغیرہ کی مثالیں ہیں۔

یعنی اس طرح سے سیاست و ادب کی وسعت پذیری ساتھ ساتھ چلنے لگی اور اس میں مزید نکھار اور گہرائی ہونے لگی لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ سیاسی میدان میں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار علاقہ اور ریاست

علم و ادب کے میدان میں بہت عروج پر نظر آتا ہے اور بعض اوقات ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں کہ سیاسی طور پر حکومت بدلی نئے چہرے سامنے آئے مگر حیرت انگیز طور پر علمی تسلسل جاری رہا۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے دوران بھی علم و ادب کی ترقی جاری وساری رہی اور یہ منقسم ریاستیں زیادہ پُرجوش طریقے سے غیر مسلم ریاستوں کا مقابلہ کرنے لگیں اور ادباء و شعراء کو نئے موضوع ملے اور یہ بات درست ہے کہ اگر صلیبی جنگیں صرف بغداد کی حکومت کے تحت لڑی جاتیں تو ان میں کامیابی کا عنصر مفقود نظر آتا تھا لیکن اب ان کا مقابلہ حمدانیوں، سلجوقیوں اور زنگیوں سے تھا جو کہ اپنی اپنی جگہ ایک بھرپور قوت تھے جب کہ سلطنت بغداد کمزور ہاتھوں میں مرکزیت کو بھی برقرار رکھنے میں ناکام نظر آرہی تھی۔

کیونکہ بغداد نام کی حد تک یا محض رسمی طور پر اب اہل عباس کے پاس تھا درحقیقت تمام انتظام و انصرام اور حکومت اتراک کر رہے تھے۔ وہ اس رسمی کارروائی یا تقدس کی علامت خلیفہ کے طور پر کبھی تو کسی کمسن بچے کو تخت نشین کرواتے یا پھر کسی کمزور شخصیت کو منتخب کر لیتے تھے تاکہ ان کے کاموں میں ان کے ارادوں میں عدم مداخلت رہے اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔ ایسے میں اگر کسی نے اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کی یا اپنے سلب شدہ اختیارات کو استعمال کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا تو اس کے سدباب کے لیے ترکوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور سخت قسم کی انتقامی کارروائیاں اس شخص کے خلاف کی گئیں جس نے اس قسم کی حرکت کی یا کرنے کا ارادہ کیا۔

لہٰذا یہ ایسا ماحول تھا جس نے شعراء و ادباء کو متاثر کیا وہ یا تو نئی حکومت کی مدح سرائی میں مشغول و مصروف رہے یا پھر ان کی برائی میں جو کہ ادھر رہ کر ممکن نہ تھی بلکہ دیگر علاقوں میں جا کر کی جاسکتی تھی۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ عباسیوں میں اب دم نہ تھا کر دفر کل کی بات تھی سطوت و جبروت اب دم توڑ چکی تھی۔ اسی دور میں ''المقتدر'' کو خلافت سونپی گئی اس کی ماں رومی تھی اور بہت زمانہ شناس و دانشمند خاتون تھی اس نے حتی المقدور کوشش کی کہ ترکی اثرات سے بیٹے کو دُور رکھا جائے اور ان کی بے جا مداخلت کو روکا جائے لیکن اس بات کی کڑی سزا دی گئی نہ صرف یہ کہ المقتدر کو قتل کر دیا گیا بلکہ بے گوروکفن سڑک پر پھینک دیا گیا اور ایک راہ گیر نے گھاس پھونس سے اس کو ڈھانپا اور اس کے بعد اس کے غیر رومی ماں کے بیٹے کو خلافت دے دی گئی لیکن اس کے خلاف بھی بغاوت ہوئی اور تاریخ اسلام میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر کر اسے اندھا کر دیا گیا اور پھر یہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس صدقہ وخیرات مانگتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

ان حالات و واقعات نے علمی و ادبی میدان سے وابستہ لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا اور وہ لوگ بھی محتاط ہوگئے تھے اب ان کے درمیان بھی گروہ بندی نظر آنے لگی تھی۔ علماء و فقہاء کے درمیان شعراء و ادباء کے درمیان اختلاف اس دور کے مظاہر میں سے ایک بڑا مظہر تھا۔ شیعہ اور سنی علماء کے درمیان اختلافات بھی اسی دور میں عروج پر نظر آتے ہیں اور ساری سلطنت مختلف مذاہب میں تقسیم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تعصب و نفرت کے رجحانات نے فروغ پانا شروع کر دیا تھا۔

شافعی مذہب مکہ و مدینہ پر غالب آیا تو عراق پر ابی حنیفہ کا تسلط ہوا اور مصر، مراکش اور افریقہ میں مالکی مذہب کو فروغ اور پذیرائی ملی اور ہر کوئی اتنا زیادہ سخت رویہ اپنائے ہوئے تھا جس میں رواداری اور یگانگت کی گنجائش نہ تھی اور مشہور مورخ طبری جب وفات پا گیا تو اس کو رات کے اندھیرے میں اس کے گھر میں ہی دفن

کر دیا گیا کیونکہ علماء کا ایک طبقہ اس کے خلاف تھا کیونکہ اس نے اپنی ایک کتاب میں مالکی، شافعی اور حنفی فقہا کا ذکر کیا تھا مگر اس میں حنابلہ فرقے کو نظر انداز کیا تھا اس سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ امام حنبل محدث تھے مگر فقیہہ نہ تھے اس چیز کو بہت ہوا دی گئی اور اس کو مرنے کے بعد بھی نہ بخشا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ شیعہ سنی اختلافات بھی اس قدر بڑھنے لگے کہ قتل و غارت سے بھی گریز نہ کیا گیا۔ خطرات اس قدر بڑھنے لگے کہ لوگ گھروں سے نکلنے سے گھبرانے لگے تھے۔

اس عہد میں جب اجتہاد کے راستے بند ہو گئے علماء و فقہا گروہ بندیوں کا شکار ہو کر رہ گئے ایک دوسرے کی ہرزہ سرائی عام ہو گئی اور ریاستوں کے امراء و وزراء بھی ان کی سرپرستی کرنے لگے تو یکسر ماحول مختلف نظر آنے لگا تھا اور اجتہاد کے راستے کا بند ہونے کا تعلق اس بات سے نہیں تھا کہ علمی مجالس کم ہو گئی تھیں یا پھر مسائل اور اختلاف نہ تھے لوگوں کے ذہنوں میں سوالات نہ رہے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ علماء کی انتشار پسندی اور بے تکے اختلافات نے عوام الناس کے شعور کو بھی متاثر کیا تھا اور ایک فقدان پیدا ہونے لگا تھا علمی بحثیں کم ہونے تھیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے اپنے طور پر بھی مناظرے اور سرکاری سرپرستی میں بھی ہونے لگے اور اس طرح سے کچھ اور نئے فرقے جن میں اوزاعی، توری اور عامری تھے وجود میں آ گئے یہ ہی نہیں بلکہ علاقائی سطح پر بیسیوں ہی نئے علماء اور جماعتوں نے جنم لیا اور ہر عالم بجائے یہ کہ کسی کی اتباع اختیار کرے وہ خود کو یکتائے روزگار سمجھنے لگا اور نئے فرقے کے ساتھ میدان میں اتر آیا تھا اور اس طرح عامیانہ قسم کے الزامات اور بحثیں ہونے لگی تھیں اور اجتہاد جو کہ علم و فن کی جان تھا، یہ پس منظر میں جانے لگا اور یوں لگنے لگا کہ علماء بانجھ ہو کر رہ گئے ہیں اور ان کے پاس سوائے الزام تراشی کے کوئی اور کام نہیں رہا ہے اور اگر کوئی عالم یا امام ایک مذہب چھوڑ کر دوسرے میں شامل ہونا چاہتا تو اس کی قدر و منزلت بالکل تباہ و برباد ہو جاتی اور وہ لوگوں کی نظروں میں بے وقعت ہو کر رہ جاتا تھا۔

ان حالات میں علما اور ادبا کی معاشی حالت بالکل برباد ہو کر رہ گئی، نت نئی فتنہ انگیزیوں میں گھر کر یہ لوگ درباروں سے بھی دور ہوئے اور ذریعہ معاش جو کہ لازم تھا اسے بھی بے اعتنائی برتنے لگے لہٰذا ان کا رہن سہن بالکل ہی مخدوش ہو کر رہ گیا اور یہ لوگ بالکل ہی محتاجین کی صفوں میں نظر آنے لگے۔ اسی لئے اس زمانے میں یہ مثل عام ہو گئی کہ عقل مند لازماً فقیر ہو گا جبکہ جاہل ضرور صاحبِ ثروت ہو گا۔

ان حالات میں لوگوں کے اندر جن رجحانات نے جنم لیا ان میں ایک بڑا رجحان مذہب کی طرف مائل ہونا تھا اور اسی سلسلے میں صوفیا مسلک یا تصوف عام ہوا، لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں اگر وہ نہیں ہے تو جو کچھ ہے اس پر راضی ہو جاؤ اور زہد و ورع کی طرف مائل ہو کر انہوں نے ذہنی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنا چاہئی۔ اس طرح سے وہ لوگ نہ صرف ذہنی تسکین حاصل کرتے تھے بلکہ ان میں قناعت پسندی بھی پیدا ہوتی تھی۔

لیکن اس کے انتہائی دوسری طرف جو رجحان نظر آتا ہے وہ چھینو اور لے لوکا ہے یعنی چوری چکاری، مکاری، لوٹ بازاری، ٹھگ بازاری اور شاطرانہ انداز میں لوگوں کا مال ہتھیانا بہت عام ہوا اور لوگوں نے اس کو اپنا حق سمجھا تھا۔ لہٰذا اس دور کے علما اور ادبا نے تصوف کے موضوعات کو اپنایا اور اس پر بے شمار تصانیف سامنے آئیں اور اس طرح سے دوسرے رجحانات کے متعلق قصے کہانیاں اور اشعار نظر آتے ہیں یعنی معاشرتی اور اقتصادی حالت کی تبدیلی سے ادب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا اور اس میں نئے رجحانات نظر آنے لگے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس دور میں عقلی اور ثقافتی طور پر بھی ترقی نظر آتی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ مختلف ثقافتوں کے ادغام میں نئی سمتوں اور نئی جہتوں کو کھول دیا تھا اس طرح سے ایرانیوں اور ہندوؤں نے عربی ثقافت میں رنگ بھرنے شروع کر دیے تھے۔ حتیٰ کہ خلفا نے بھی دست شناسی، نجوم و طب کی طرف توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ ایک تو یہ علمی وسعت تھی دوسرے اس نے افسانے کی نئی راہیں متعارف کروائیں، نئے علوم سامنے آنے لگے اور اس کے ساتھ ساتھ طبعیات، ریاضیات اور الہیات کو بھی ترقی ملنا شروع ہو گئی۔ علما کرام بالخصوص یونانی فلسفے سے بہت متاثر نظر آنے لگے اور انہوں نے دین، خطابت و بلاغت کے ساتھ ساتھ فلسفے کو بھی رواج دینا شروع کر دیا تھا۔

اس صدی سے قبل بھی اگرچہ دیگر زبانوں سے تراجم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا مگر بالخصوص اس دور میں اس طرف خاص توجہ دی گئی اور دنیا کے ہر کونے سے مختلف زبانوں کے جاننے والوں کا ادغام درباروں میں ہوا اور عربی زبان کی وسعت کے باعث اس زبان میں بے شمار علوم کی کتب کے تراجم ہوئے اور عربی کتب کو بھی باہر کی دنیا میں تعارف حاصل ہوا اور اس طرح سے ہر زبان کی کتابیں عام نظر آنے لگی تھیں۔ ابن ندیم نے اپنی کتاب ''الفہرس'' میں اس طرز کی بے شمار مثالیں دی ہیں اس سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ ایک زبان کے جاننے والے دوسری زبان کی بے شمار مثالوں اور الفاظ سے متعارف ہوتے اور اس کو عام بول چال میں بھی استعمال کرنے لگے حتیٰ کہ علماء و ادباء نے بھی اپنی تخلیقات و نگارشات میں دیگر زبانوں کا استعمال کیا جس سے عبارت کا حسن دوچند ہو جاتا تھا اور ادیب و عالم کی قابلیت و علمیت کی دھاک بھی لوگوں پر بیٹھی تھی۔

ابن مقفع نے نہایت فصیح و بلیغ طریقے سے فارسی زبان کی مشہور زمانہ کتاب کلیلہ و دمنہ کو عربی زبان میں منتقل کیا اسی طرح سے حسین بن اسحاق نے یونانی زبان کے بے شمار تراجم کیے یعنی چوتھی صدی ہجری میں دیگر زبانوں کا عروج مسلمانوں میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور حتیٰ کہ ہندی زبان کے ماہر بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے عربی سے ہندی اور ہندی سے عربی میں اور فارسی میں ترجمے کرنے میں کمال حاصل کیا اور اسی دور میں بعض علماء نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کلیلہ و دمنہ اصل میں ہندی کتاب ہے کہ فارسی کتاب ہے۔ اس سے بھی تحقیق کی بہت سی راہوں نے جنم لیا اور لوگوں میں دیگر زبانوں کے ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

ادباء و علماء نے نہ صرف دیگر زبانوں کے ادب کو اپنایا بلکہ ان پر بھی اپنا اثر چھوڑا یعنی وہ متاثر بھی ہوئے اور انہوں نے متاثر بھی کیا۔ جیسا کہ یونانی فلسفے میں قضاء و قدر کے مسئلے میں اسلامی رنگ بھرنا مسلمانوں کا ہی شاخسانہ ہے اور اس سوچ کو اسلامی تعلیمات کی رو سے پانا اور پرکھا جانا بھی اسی دور کا حصہ ہے بالخصوص جب شیعہ سلطنت وجود میں آئی تو انہوں نے صحیح معنوں میں فلسفے و حکیم کو فروغ دینا شروع کر دیا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ظاہر و باطن کا مسئلہ عام طریقے کی بجائے فلسفیانہ طریقے سے سمجھنا بھی آسان تھا اور لوگوں کو اس جانب متوجہ کرنا بھی آسان تھا۔ لہٰذا انہوں نے ان مقاصد کے لیے فلسفے کو اپنے قریب تر پایا اور فلسفہ چونکہ جمود کو توڑتا ہے اور جدید نظریات کی طرف راغب کرتا ہے یہ ہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں شیعہ فلاسفر عام ہوئے جیسا کہ فارابی اور اخوان الصفاء و ابن سینا وغیرہ کے نام اس ضمن میں لیے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کے اندر فلسفے کی نشو و نما نے وسعت پذیری بخشی اور یہ ہی زمانے اسکے عروج کے بھرپور زمانے کہے جا سکتے ہیں کیونکہ حکمرانوں امراء اور وزراء نے بھی اس کی سرپرستی اپنی اپنی جگہ پر کرنا شروع کر دی تھی۔

اس عہد میں جو طبقاتی تقسیم ہوئی اور سماج مختلف عناصر میں بٹا ہوا نظر آنے لگا تو اس کی توضیح یہ کی گئی کہ ہندو رسوم ورواج، اہل فرس کا طرز رہن سہن چونکہ عام ہوا ہے لہٰذا یہ طبقاتی تعصب عام ہوا ہے ہوسکتا ہے کہ یہ بات کسی حد تک درست ہی ہو لیکن ہمیشہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور عام طبقے میں فرق تو رہا ہی ہے۔ وزراء وامراء کا رہن سہن اٹھنا بیٹھنا، سواری، کھانا پینا وغیرہ سوائے چند نادر مثالوں کے عوامی طبقے سے الگ ہی رہا اور خواہ وہ اندلس کی سرزمین ہو یا افریقہ کے صحراء مراکش کے حکمران ہوں یا دمشق کے بغداد کا دربار ہو یا ایران کا، شاہوں کے ہاں لونڈیاں غلام، محلات، عطورات، آسائشیں وزیبائش عام سی بات ہے۔

لیکن اب اس آسائش وزیبائش میں، رہن سہن میں، کھانے پینے، میں دیگر تہذیبوں کا رنگ بھی نظر آنا شروع ہوگیا تھا مثلاً ایرانی تہذیب کے زیر اثر عباسی خلفاء نے زیورات کا استعمال، باغات کی سجاوٹ وغیرہ کو اپنانا شروع کردیا تھا۔ رقص وغناء جام وسبو کی محافل جو کہ پہلے کچھ پردہ داری میں ہوتی تھیں اب کھلم کھلا ہونے لگی تھیں۔

دولت وثروت کی نمود ونمائش نے کسی اور کو فائدہ پہنچایا ہو یا نہ مگر یہ بات واضح ہے کہ اس سے اہل علم و ادب کو ضرور فائدہ پہنچا۔ ان کی درباروں سے وابستگی انکی اپنی شان وشوکت سے زیادہ خلفاء امراء کی شان وشوکت قرار پانے لگی تھی اور بعض ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کسی دربار سے وابستہ شخص کو تنخواہ اس دور کے وزراء سے بھی زیادہ لگادی گئی تھی۔ جس نے حاکم کی مدح سرائی کی جس نے امراء کی تعریف وتوصیف کی جس نے وزراء کی شان میں قصیدے لکھے اس کے دن پھر گئے اور جس نے اس سے اجتناب برتا وہ غربت کے تیشے کے ہاتھوں پس کر رہ گئے، نئی حکومت آئی اور پھر انکے دن پھرنے لگے گویا یہ مکافات عمل تھا۔

سیف الدولہ حمدانی نے ''المتنبی'' کو اس قدر نوازا تھا کہ اسکی مثال نہیں ملتی کیونکہ المتنبی اسکی مدح سرائی کیا کرتا تھا لیکن یہ ہی سیف الدولہ ابی فراس جو کہ المتنبی کا قریبی رشتہ دار تھا اسکے لیے انتہائی بخیل واقع ہوا اسی طرح سے ابوحیان التوحیدی اور المیدانی بھی درباری قصیدہ گوئی کرنا نہیں چاہتے تھے اور اسی وجہ سے بہت عرصے تک وہ امراء وزراء کی نظروں میں نہ آسکے جبکہ اس سے کم درجے کے لوگوں نے بہت جلد شہرت کی بلندیوں کو چھولیا۔

اس صدی میں مسلمان دیگر چیزوں کے ساتھ دوسری قوموں کے فن تعمیر سے بھی متاثر ہوئے اور جہاں ان کے اجزائے ترکیبی سے اپنے درباروں کو زیب وزینت بخشی، وہاں انکے ماہرین کو بھی انعام وکرام سے نوازا اور جب یہ محلات ورہائش گاہیں علم ودانش کے موتی بکھیرنے والوں کی محفلوں سے سجی تو ان کی رونق میں دو چند اضافہ ہوا ان محفلوں میں شعروشاعری، ادبی قصے، نادر خیالی، بدلہ سنجی اور خوبصورت زبان کا استعمال عام تھا، اور ساتھ ہی رقص وسرود کی محفلیں اور جام وسبو کے دور بھی چلتے تھے اور جس دربار میں جس قدر زیادہ اسراف ہوتا اس کے قصے اتنے ہی زبان زد عام ہوتے۔ مشہور زمانہ کتاب ''الاغانی'' میں اس طرح کی علمی وادبی محافل کا حال تفصیل سے ملتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح امراء وزراء خوش ہوکر جود وسخاء کرم نوازی کی مثالیں قائم کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔

سیف الدولہ کے دربار میں المتنبی، ابونواس، فارابی، ابن خالویہ اور یعقوب بن کلس ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ حاکموں اور وزراء کی مجالس کے علاوہ اس زمانے میں یہ رجحان بھی سامنے آتا ہے کہ علماء وادباء وشعراء نجی محفلیں منعقد کرتے تھے جو کہ ان کے دیوان خانوں وغیرہ میں ہوتی تھیں اور ان نجی محفلوں میں چونکہ لوگ آزادی

سے شامل ہوسکتے تھے لہٰذا ایک بڑا عوامی طبقہ اس سے مستفید ہوتا تھا ان مجالس کے منعقد کرنے والوں میں ابن ابی عامر، مسلیمان المظفی وغیرہ نے بہت نام کمایا ہے اور ان ہی محفلوں میں شرکت کرنے والوں اور سخن گوئی کرنے والوں نے اس زمانے کا اہم اور معتبر ادب ترتیب دیا ہے۔

اس صدی کی ایک اور خاص بات گھروں اور درباروں کے علاوہ شاہراؤں پر موسیقی کا عام ہونا ہے اس میں اشعار کا برملا اور برمحل استعمال ہوتا اور حتیٰ کہ بڑے بڑے شاعر بھی اب اپنی شاعری کو لحن کی صورت میں پیش کرنے لگے تھے۔ اور لوگوں نے پہلے سے کہیں زیادہ ذوق شوق سے اب شعراء کو سننا شروع کردیا تھا۔

اس طرح سے دیکھا دیکھی عوامی شاعری سامنے آئی اور غلاموں اور لونڈیوں نے ادبی اصولوں یا گرائمر کے قواعد کو بالائے طاق رکھ کر وزن اور قافیے کو نظر انداز کر کے شاعری کرنا شروع کردی۔ انہوں نے اسم ظرف، اسم الھیئۃ، فعل تام، فعل معتدی فعل لازم کو نظر انداز کر کے عام فہم سادہ زبان استعمال کی جس سے لوگ بہت لطف اندوز ہوتے تھے اور محفلیں سجی رہتی تھیں یعنی الجستری اور ابی تمام کی خوبصورت اور بامحاورہ زبان کیساتھ عوامی شاعری بھی اس دور میں پیچھے نہ رہی اور بہت جلد لوگوں میں مقبول عام ہونے لگی، جبکہ اہل زبان طبقے نے اس عام فہم استعمال کو قطعی نری جہالت قرار دے دیا تھا۔

جبکہ دوسری طرف اس عام فہم اسلوب کا اثر علمائے ادب پر بھی نظر آتا ہے۔ وہ لوگ بھی عوامی پسندیدگی کے پیش نظر اب اس طرف مائل نظر آنے لگے تھے۔ اور اب انہوں نے اپنی اعلیٰ ترین روایت کے برعکس محفلوں میں اشعار کو گا کر سنانے میں عیب محسوس نہ کیا تھا اور وہ فصیح وبلیغ وبان کیساتھ سادہ زبان کو استعمال کرنے لگے تھے تاکہ ادب وعلم درباروں سے نکل کر عوام الناس کے اندر بھی عام ہوسکے اور شرف قبولیت حاصل کرے۔ اسکی مثال الثعالبی کی ہے جو کہ مشہور زمانہ نحوی تھا وہ بھی لحن کو پسند کرتا تھا۔

اس کے پیش نظر بہت سی ایسی کتابیں رقم ہوئیں جس میں گائیکی اور لحن کی صورت میں قصے وکہانیاں لکھی گئیں اور عوامی پسندیدگی کے پیش نظر عام فہم کتابیں منظر عام پر آنے لگیں جن میں الحریری کی ''المقامات'' اور فعلت اور ''افعلت'' نامی کتابیں ہیں جنکا اسلوب انتہائی سادہ مگر پرتاثیر ہے۔ اگرچہ اس میں ادبی اور فنی لحاظ سے غلطیاں پائی جاتی ہیں مگر ان باتوں نے ان کی مقبولیت میں کمی نہیں ہونے دی تھی بلکہ آج تک یہ اسی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

عام اور سادہ زبان کے استعمال کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں خالص اور فصیح وبلیغ عربی زبان کے استعمال کیساتھ کیساتھ علاقائی زبانوں کو بھی فروغ ملا اور ہر علاقے کی زبان نے بھی ترقی کرنا شروع کردی تھی مگر یہ بات باعث اختلاف ہی رہی کہ زبان کا اسطرح سے علاقائی سطح پر لفظوں کو بگاڑ کر استعمال کرنا یا قواعد کو نظر انداز کر کے استعمال میں لانا معیوب ہے یا نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ اس بات نے ترقی کی نئی راہیں کھول دی تھیں۔ خواہ ایک طبقہ ہمیشہ اسکا مخالف رہا ہو۔ بڑے بڑے عالم وفاضل لوگوں نے زبان دانی کے اس فروغ کو اچھی نظر سے نہ دیکھا اور اپنے اصول وضوابط پر سختی سے قائم دائم رہے اور یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ دراصل یہی وہ لوگ تھے جن کے دم قدم سے آج تک عربی زبان اپنی خالص واصل شکل میں قائم ودائم چلی آرہی ہے۔ انہوں نے زبان کو پورے سیاق وسباق وقواعد ونحو کے ساتھ اس کی ساکھ ومرتبے کا خیال رکھتے

ہوئے محفوظ رکھا ورنہ ممکن تھا کہ عوامی انقلاب اور اس کی پسندیدگی کے پیش نظر خالص زبان صرف قدیم کتابوں تک ہی محدود ہو جاتی مگر اب خالص زبان ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی پوری آن بان شان کے ساتھ موجود و محفوظ ہے۔

ابن حجاج اور ابن سکرۃ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے عام الفاظ، مثالوں اور محاوروں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کا استعمال بھی کیا بلکہ عام محاورات رسوم و رواج کو خوبصورت شکل میں اپنی تصانیف کا موضوع بنایا۔ ان کی کتب میں فارسی زبان کا استعمال کثرت سے نظر آتا ہے۔ اس طرح سے خالص زبان اور عوامی زبانیں ساتھ ساتھ ترقی کی منازل طے کرتی گئیں اور پھر رفتہ رفتہ عوامی زبان میں بھی کتابیں لکھی جانے لگیں اس میں شعرا کے دیوان سامنے آئے اور شاعری کی بہت سی نئی طرحوں مثلاً موشحات و ازجال کے علاوہ عام ضرب الامثال بھی بننی شروع ہو گئیں اور ایک وہ وقت بھی آیا کہ اس کے پھیلاؤ اور وسعت کے پیش نظر ان زبانوں کے قواعد بھی ترتیب دیئے جانے لگے اور ان میں پھر بعد میں جرائد مجلّات اور اخبارات بھی منظر عام پر آئے اور اس طرح عام زبان خالص زبان کا مقابلہ کرنے لگی تھی جو کہ بجائے خود ترقی کی علامت تھی۔

جہاں تک علمی و ادبی محفلوں کا تعلق ہے جن کا ذکر کیا گیا ہے وہ بعض اوقات اتنی طویل ہوتی تھیں کہ ایک نشست میں مکمل نہ ہو پاتی ہیں بلکہ بعض اوقات انہیں کئی کئی دن تک مختلف نشستوں میں جاری رکھنا پڑتا تھا اور لوگوں کی دلچسپی اس میں برقرار رہتی تھی۔ ابوالحیان توحیدی اپنی تصنیفات میں جا بجا اس قسم کی محافل اور ان کے موضوعات کو زیر بحث لاتا تھا کہ بعض اوقات ایک بات موضوع بنتی اور اتنی لمبی بحث شروع ہو جاتی کہ اس کا سمیٹنا مشکل نظر آتا تھا۔ ایک امیر سلیمان المنطقی کے ہاں ہر ہفتے زبان و ادب کے بارے میں بحث چلتی اور فلسفے پر ختم ہوتی تھی۔

ابوالحسن العامری اور اس کا غلام زحل جو اعلیٰ ادبی ذوق کا مالک تھا دونوں ادبی و علمی مقابلے منعقد کروایا کرتے تھے اور اس کی خوب تشہیر کی جاتی تھی تا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس میں شریک ہو سکیں۔ کتاب ''الھوامل والشوامل'' اس کی ایک مثال ہے اسی طرح سے یاقوت الحموی نے اپنی کتاب ''معجم الادباء'' میں ایسی مثالیں دی ہیں۔

اس زمانے میں حکمرانوں کی طرف سے جو ظلم و ستم اور ناجائز کام ہوتے تھے۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ علماء و ادباء کی بڑی تعداد اس پر خاموش رہی اور انہوں نے اس کے خلاف نہ تو احتجاج کیا اور نہ ہی آواز اُٹھائی بلکہ ہمیں وہ لوگ جب حکمرانوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ اس ظلم و ستم کی حمایت کرتے تھے یا پھر ان میں اتنی جرأت و ہمت نہ تھی کہ ان کے خلاف آواز بلند کرتے۔

مثلاً سیف الدولۃ کا قاضی جو کہ لوگوں سے زبردستی مال و دولت وصول کرتا تھا۔ ابوالطیب المتنبی سیف الدولہ اور اس کے قاضی اور وزراء کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے اور اسے ملک کریم، ملک عادل کے خطابات سے یاد کرتا ہے جو کہ تاریخی حقائق و حوالوں کے بالکل منافی ہے لیکن اس کے عوض المتنبی کو اس قدر مال ثروت سے نوازا گیا تھا کہ اس نے اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔

مگر اس ماحول میں بھی چند ایسے حقیقت پسند لوگ تھے جنہوں نے اس ظلم و ستم کو پسند نہیں کیا اور ان کے خلاف آواز اُٹھائی ان میں اسماعیلی فدائین کے سربراہ ''احسن الصباح'' وغیرہ تھے مگر اس کے نتیجے میں شیعہ و سنی اختلافات نے جنم لیا اور اس مخالفت کو مذہبی رنگ دے دیا گیا اور فتنہ و فساد کے نتیجے میں بے گناہ لوگ مارے جانے

لگے تو عقلی اور ذہنی طور پر لوگوں میں جمود پیدا ہونا شروع ہوا اور ہر طرح کے تعصبات ابھر کر سامنے آنے لگے۔ نئے نئے اعتقادات، نجوم، صوفی ازم کے ساتھ ساتھ ذہنی و فکری انتشار نے جنم لیا اور حتیٰ کہ بعض صوفیا بھی اس انتشار اور تعصب کی زد میں آ گئے جیسا کہ ابوالعلاء المعری نے اپنی کتاب ''الفروضیات'' میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔

یہ ماحول ایسا تھا جو کہ قوم کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس زمانے میں دوسرے انتشار و تعصب کے ساتھ نسلی و مذہبی و لسانی تعصّبات نے بھی سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا جیسے کہ ایرانی، ترک اور عربوں کے درمیان تھا یا پھر مصریوں، یمنیوں اور حجازیوں میں تھا اور مالکی، حنبلی اور شافعی ہیں اور شیعہ اور سنیوں میں تھا الوشاء نے اپنی کتاب ''الحرفاء'' نے اس حوالے سے جو تصویر کشی کی ہے اس سے اس ماحول کا پتہ چلتا ہے کہ تعصب میں یہ لوگ کس حد تک آگے چلے گئے تھے اور کیسے ایک دوسرے کے خلاف طعنہ زنی کیا کرتے تھے اس میں منافقت کا عنصر بھی بہت نمایاں نظر آتا ہے اس کے ساتھ ساتھ شراب نوشی بھی عام ہونے لگی۔ عام شخص کے لیے معاش پریشانی کا باعث بنا تو ایسے میں دیگر برائیاں عام ہونے لگیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر سماج اس قسم کے رویوں کا شکار نہ ہوتا تو ہمارے سامنے علم و ادب کی یہ صورت سامنے نہ آتی اور نہ ہی تصوف اپنے عروج پر نظر آتا اور نظریاتی طور پر نت نئے رجحانات اس شکل میں نہ ابھرتے۔ عربی ادب میں مدح و توصیف کی یہ حالت نہ ہوتی اور شیعہ ازم کو بھی اتنا فروغ نہ ملتا اور نہ ہی رسائل اخوان الصفاء اس نہج پر نظر آتے اور نہ ہی معاشرتی روایات و حکایات اور قصے کہانیوں پر مشتمل ایک بڑا ادبی سرمایہ وجود میں آتا۔

جب سیاسی طور پر حکمرانوں نے ظلم و ستم کو شیوہ بنایا تو اکثر علماء نے اس چیز سے لاتعلق ہو کر اس سے اجتناب برت کر اور زور و شور سے علم و ادب کو اپنا مرکز بنا لیا یا پھر تصوف کے رنگ میں دوب گئے اس میں ایک طرف تو انہیں خود سکون ملتا تھا دوسری طرف یہ دوسروں کے لیے بھی سکون کی دوا فراہم کرتے تھے ان میں ایسے لوگوں کی مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں جو کہ سلطان یا وزیر سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اسے کسر شان جانتے تھے اور ان میں چند ایسے لوگ بھی تھے جن کا گزارا وقت کے حکمران کی دوستی کے بغیر نہیں تھا وہ اس قرب اور سنگت میں فخر محسوس کیا کرتے تھے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔

اس طرح علماء و فضلاء نے جب ظلم و ستم کے خلاف آواز نہ اُٹھا کر اور لوگوں کو صبر کی تلقین کر کے اور ماحول کا حصہ بن جانے کا کہہ کر انہیں مطمئن کر دیا تو لوگوں نے نئے نظریات جیسے فلسفہ، فارابی اور ابن الہیثم کے خیالات کو اپنانا شروع کیا اور اب غزل غلاموں یا لڑکوں کی خوبصورتی کے متعلق لکھی جانے لگی تھی جو انتہائی فحش نگاری کے ضمن میں آتی تھیں۔ اس صنف میں ابونواس، ابن حجاج اور ابن عسکرہ پیش پیش تھے۔

اسی طرح سے مختلف ظریفانہ حرکات اور ان کا بیان اور مختلف حیلے اور حربوں سے لوگوں کو لبھانے کا جو رواج ہوا اس کو بھی ادب میں جگہ ملنا شروع ہو گئی جیسا کہ بدیع الزمان اور الحریری نے کہا کہ اسی طرح محدثین نے خیر و شر کو مدنظر رکھے بغیر بس بیان کرنا شروع کر دیا اور عقل کی جگہ نقل کا رواج ہونے لگا اور کتابوں کا تقدس پامال ہونے لگا تھا یعنی یہ نئے ادبی اور علمی رجحانات چوتھی صدی ہجری کی ہی پیداوار تھے اور بہت سی ثقافتوں کے امتزاج نے علوم و ادب کو نئی راہیں دکھا دی تھیں۔ اب ادباء نے کتابوں کے ڈھیر لگانے اور حکمرانوں کو لبھانے پر بھی توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ اب جدت کی بجائے جمع کرنے یا تجدید کا کام زیادہ تھا جیسا کہ ''المسالک والممالک'' صبح

الاعشیٰ، نہایۃ الاءادب وغیرہ کی خاصیت تھی۔

اب ادب میں وسعت پذیری دقیق معنوں میں نہ تھی حالانکہ عربی ادب تو جاہلیت کے زمانے میں بھی بہت زیادہ موضوعات لیے ہوئے تھا اور اس نے ایک زمانے کو اپنی گرفت میں لیے رکھا تھا مگر اب فرس، ہنود و یونان نے اس پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا جیسا کہ ابن المقفع یا ابونواس وغیرہ کی مثالیں ہیں انہوں نے معاشرے کی صحیح عکاسی کی تھی اور اجتماعی حیات کو محض صاف ستھرے ادب کی خاطر نظر انداز نہیں کیا تھا بلکہ جو ہوا تھا یا نظر آ رہا تھا اس کو انہوں نے ادب میں جگہ دے کر تاریخ کا ایک پہلو آنے والی نسلوں کے سامنے رکھ دیا۔

ہوسکتا ہے کہ بہت سے دوسرے لوگ بھی ایسا چاہتے ہوں مگر معاشی مجبوریوں کے باعث وہ کھل کر بات کہنے کے مجاز نہ تھے ممکن ہے کہ اگر ان کو مجبوریاں نہ ہوتیں تو ادب کے بہت سے اور پہلو ہمارے سامنے آتے بغداد اور قاہرہ جو کہ علم و ادب کے بنیادی مراکز تھے اس کے ساتھ دیگر علاقوں کے دارالحکومت بھی اس تقلید میں پیش پیش نظر آ رہے تھے اور بہت دُور دراز کے علاقوں میں بھی شاندار تخلیقات وجود میں آ رہی تھیں اور عربی ادب کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں دیگر زبانوں کا رنگ بھی غالب آ رہا تھا مگر عربی زبان کی اہمیت اپنی جگہ برقرار رہی تھی۔ آل بویہ نے فارسی سے زیادہ عربی زبان و ادب کے فروغ پر توجہ دی تھی۔

علماء و ادباء کے ساتھ ساتھ بعض امراء و وزراء خود بھی صاحب تصنیفات تھے یا پھر اچھا ادبی ذوق و شوق رکھتے تھے گویا کہ اچھی سیاست کے لیے ان کے نزدیک اچھا ادب دیکھنا اور اس سے متعارف ہونا ضروری تھا جیسا کہ ابن العمید، ثعالبی صاحب ابن العماد اور ابن مکس نہ صرف خود عالم و فاضل تھے بلکہ علم و ادب سے وابستہ لوگوں کو دوست بھی رکھتے تھے۔ مذکورہ اشخاص کی کتب علم و حکمت کے خزانوں سے موسوم کی جاسکتی ہیں۔ بالخصوص ابن العمید صاحب الرائے وزیر بھی تھا اور اس کے ساتھ بلند پائے کا ادیب بھی تھا یہ اپنے ہاں ادبی محافل اور مشاعروں کے انعقاد میں شہرت رکھتا تھا اور ان کے لیے ہر مرتبہ خود موضوع منتخب کرتا تھا۔

المھلبی جو کہ ادب کی وجہ سے سیاست میں آیا تھا پہلے بہت عسرت کی زندگی بسر کر رہا تھا مگر جب اس کے ادبی شہ پارے لوگوں کی نظروں میں آئے تو اس نے بے حد ترقی کی اور وزارت کے عہدے تک جا پہنچا۔ اسی طرح صاحب ابن عباد جو کہ نقد میں اپنا علیحدہ مقام رکھتا تھا وہ سیاست میں آنے کے بعد بھی بغداد کے عالموں کے لیے پانچ ہزار دینار سالانہ روانہ کیا کرتا تھا کہ وہ معاشی پریشانیوں سے محفوظ و مامون رہ سکیں اور ابن سعد جو کہ صمصام الدولہ کے دربار سے وابستہ تھا اور ماہر فلاسفر بھی تھا یہ فلسفے کی ترقی و ترویج کے لیے کوشاں رہا۔ اس کی مجالس میں ابوالحیان التوحیدی بھی حاضر ہوتا تھا اور دونوں کے درمیان اعلیٰ درجے کی فلسفیانہ بحثیں ہوتی تھیں اور نت نئی فلسفیانہ موشگافیوں سے لوگ متعارف ہوتے تھے۔

ابن سعدان اس بات پر فخر کرتا تھا کہ اس کے پاس زمانے کے بہترین لوگ ہیں اور اس کا کہنا بجا بھی تھا کیونکہ اس کے پاس عیسیٰ بن رعۃ جیسا فلاسفر، ابن عبد جیسا کاتب، ابن الحجاج جیسا شاعر، ابوالوفاء جیسا واعظ، مسکویہ اور ابوالقاسم والاہوزی جیسے عالم دین اور سراج بن اردیشر جیسے لوگ شامل تھے اور اگر ان لوگوں کا نام اس زمانے سے نکال دیا جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔

یعنی اس زمانے کے حکمرانوں کا ظلم و ستم ایک طرف مگر علم دوستی اپنی جگہ تھی۔ آل بویہ ہو یا عباسین،

فاطمین ہوں یا مراکشی، ان سب نے علم و ادب کی ترقی کے لیے بہت کام کیا تھا۔ حاکم بامر اللہ نے دارالحکمۃ کی بنیاد رکھی جس میں لوگ انواع و اقسام کے علم میں دسترس حاصل کرتے تھے۔ اس کا وزیر ابن مکس جو کہ یہودی تھا اور اس نے بعد میں اسلام قبول کیا تھا بے حد محبِّ علم تھا اس کے اردگرد علماء و ادباء کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ ہر جمعہ کی رات کو اپنے ہاں مجلس منعقد کرتا تھا۔ اس میں وہ ذاتی کاوشیں اور نگارشات پیش کرتا تھا اور دوسروں کی تخلیقات بھی سنتا تھا اور کھل کر تنقید کرتا بھی تھا اور اپنے اوپر تنقید برداشت بھی کرتا تھا۔ اس کے گھر میں ہمہ وقت کاتبین موجود ہوتے تھے جو کہ ہر موضوع پر کتابیں لکھتے تھے اور تراجم کرتے تھے۔ یہ روزانہ ان کے پاس حاضر ہوتا تھا اور ان سے سوالات کرتا تھا اور ان سب کو اس کی طرف سے طعام فراہم کیا جاتا تھا اس کے ساتھ ساتھ اپنے مشاعروں کے انعقاد میں بھی شہرت حاصل کی۔

دوسری طرف حلب اور الجزیرۃ میں سیف الدولہ تھا جس کی مجالس بھی شہرت دوام لیے ہوئے تھیں۔ اس کے ہاں بھی اپنے وقت کے بہترین عالم و فاضل جمع رہتے تھے اور یہ ان پر انعامات کی بارش کیے رکھتا تھا اور علماء و ادباء کے لیے اس کے دربار سے وابستہ ہونا بجائے خود فخر کی بات تھی اس کے دربار سے وابستہ لوگوں میں فارابی جیسے فلاسفر اور ابن خالویہ جیسے صاحب صرف و نحو تھے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری نے نامور ادیب، عالم و فاضل لوگوں کو جنم دیا جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ میں ابراہیم المزوقی، قدوسی، الحمادی اور ابن السراج کا نام اور حدیث کے ضمن میں الدراقطنی و نیشاپوری، زبان و نحو میں ابن درید، ابی علی فاری، التماس بن فارسی، ابن الزجاج، درستوریہ، ابن سراج، شعر و شاعری کے میدان میں المتنبی، ابی فراس، الغاشی، ابن حجاج، ابونواس، ابن سکرۃ، ابن طباطبا اور ادب میں ابی ہلال العباس، خوارزمی، حجطہ برمکی، بدیں الزمان ہمدانی، علی بن عبدالعزیز، جرجانی، تاریخ میں الطبری، ابن زولاق، التالبش، المسعودی، جغرافیہ میں اصطخری، ابن خزدابۃ، علم الکلام میں الجبائی والشعری اور خطابت وغیرہ میں ابن تمام وغیرہ کا نام آتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی علماء و ادباء کی ہر صنف میں طویل فہرست ہے جو اپنے اپنے فن میں کمال کو پہنچے اور ان کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ یہ لوگ صرف ایک علم یا فن کے ماہر نہ تھے بلکہ اس زمانے کے رواج کے مطابق ایک عالم کا علم بہت سی شاخوں میں پھیلا ہوتا تھا وہ محدث بھی تھا ریاضی دان بھی تھا، فلاسفر بھی تھا اور شاعری بھی کرتا تھا، غرض یہ کہ علم کے حصول میں محدودیت نہ تھی بلکہ وسعت پذیری تھی، جمود نہ تھا بلکہ بہاؤ تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری بہت زرخیز تھی اور حکومتیں آتی اور جاتی رہیں مگر علم و ادب کے میدان میں کام جاری و ساری رہا۔ مختلف نظریات اور خیالات سامنے آئے اور پھلے پھولے، مختلف ثقافتیں ملیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوئیں۔ ادب کے ساتھ ساتھ نئے علوم کی طرف بھی توجہ دی گئی اور اس طرح سے ریاضی، فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، علم الحیوانات و نباتات وغیرہ، جغرافیہ، تاریخ و ادب کے ساتھ فروغ پاتے رہے۔ یعنی علمی ثقافت ادبی ثقافت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی کیونکہ ادبی ثقافت کو ذہن کی وسعت ترجمانی احساسات و خیالات اور معاشرتی زندگی کی عکاسی کے لیے ضروری خیال کیا گیا تھا اور علوم و فنون کی ثقافت ترقی، جدت اور عقل کی ترویج کے لیے بہت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اسی لیے اس زمانے میں جامعۃ العلوم اور جامعۃ الادب بنائی گئیں۔ ہر چند کہ علوم سے زیادہ مسلمانوں نے بعض عشروں میں ادب کی طرف زیادہ توجہ دی اس کی وجہ

یہ ہوسکتی ہے کہ یہ لوگ بنیادی طور پر عرب تھے زبان دان تھے اور دوسری طرف حکمرانوں کی مجالس کو بھی علم سے زیادہ ادب رونق بخشتا تھا۔ خوبصورت فقرات، اشعار کا برمحل استعمال، مدح وتوصیف اور استعارے اور کنائے کا لطیف ذوق محفل کو گرما دیتا تھا جب کہ علوم یہ صفت اپنے اندر نہیں رکھتے تھے اور خشکی کے حامل تھے۔

لیکن کچھ بھی ہو یہ بات اپنی جگہ مصدق ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے دور میں علم وادب کے میدان میں جو ترقی ہوئی جو شاہکار سامنے آئے جو تخلیقات ہوئیں بعد کے دور میں ایک تو سیاسی طور پر تباہی و بربادی کی وجہ سے اور دوسرے دیگر اقوام کے تدخل سے ایسا نہ ہوسکا۔ ممکن ہے کہ اگر تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی تباہی و بربادی بغداد وعراق میں اور اندلس میں عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی گردن زنی نہ ہوتی تو علم وادب کے اور ذخائر ہمارے سامنے آتے مگر صد حیف کہ اس کے بعد بڑے عرصے تک عالم اسلام پر جمود طاری رہا اور چوتھی صدی ہجری والا ماحول لوٹ کر نہ آسکا اور جو کچھ بعد میں ہوا وہ اس صدی میں کیے گئے کام پر یا تو تنقید تھی یا پھر تقلید تھی۔

مقالے کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے۔

۱۔ التمدن الاسلامی، جورجی زیدان۔
۲۔ الظرف والظرفاء، الوشاء۔
۳۔ معجم البلدان، یاقوت الحموی۔
۴۔ وفیات الاعیان، ابن خلکان۔
۵۔ رسالۃ التصوف، محمد المحسن الحسینی۔
۶۔ تصوف فی تاریخ اسلامی، ابوالعلا عفیفی۔
۷۔ حضارۃ الاسلام فی القرآن الرابع الھجری، آدم متز۔
۸۔ ظہر الاسلام، احمد امین۔
۹۔ المقدمۃ، ابن خلدون۔
۱۰۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔
۱۱۔ تہذیب الاخلاق، المسکویہ۔
۱۲۔ قرأت العالم العربی، حافظ قدری طوقان۔
۱۳۔ حضارۃ العرب، گوستاف لوبون۔
۱۴۔ فتوح البلدان، البلازری۔
۱۵۔ تاریخ طبری وتاریخ المسعودی۔
۱۶۔ فی الحضارہ الاسلامیۃ، بیکر۔

❋ ❋ ❋

شوکت نعیم قادری

ملتان کے حوالے سے ایک اُردو تلمیح

ملتان، بلاشبہ دنیا کا قدیم ترین آباد شہر Living City ہے۔ اسے مدینۃ الاولیا اور درگاہوں کا شہر The city of Saints and Shrines بھی کہا جاتا ہے اور اب تو ملتان کو ایک اور خطاب (آموں کا شہر) The City of Mangoes (۱) سے بھی نوازا گیا ہے اگرچہ اِس کی یہ پہچان بھی بہت قدیم ہے۔

ملتان ثقافتی، سماجی، لسانی، تعلیمی، مذہبی اور تاریخی حوالے سے اپنی ایک منفرد شناخت اور اہمیت رکھتا ہے۔ اس تناظر میں ملتان کا حوالہ کسی تلمیح کی صورت بھی دَر آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ یقیناً ملتان کے حوالے سے اور تلمیحات بھی ہوں گی مگر اس مختصر تحریر میں صرف ایک اُردو تلمیح کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے مگر اس سے پیش تر برسبیلِ تذکرہ ایک نظر صنعتِ تلمیح پر بھی ڈالتے ہیں۔

تلمیح عربی زبان کا کلمہ ہے اور اسم مونث ہے۔ اس کے لغوی معانی ''اشارہ کرنا'' یا ''اچٹتی نگاہ ڈالنا'' کے ہیں۔ اس کا مادہ لفظ ''لمح'' ہے جس کا مطلب ''پلکیں جھپکنا'' ہے۔ اس وضاحت سے تلمیح کی ایک اہم خصوصیت اختصار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تلمیح کا انگریزی مترادف Allusion ہے۔

''علمِ بیان کی اصطلاح میں جب کوئی لکھاری اپنی تحریر (نظم ونثر) میں ایسے الفاظ لائے جو قرآنی آیت، حدیث نبوی ﷺ، ضرب المثل، کسی تاریخی، نیم تاریخی واقعہ یا کسی مشہور شخص، جگہ یا چیز کی جانب اشارہ کریں تو اسے صنعت تلمیح کہا جاتا ہے۔''

اب ہم موضوعِ بحث تلمیح کی جانب آتے ہیں۔ یہ تلمیحی محاورہ یوں ہے:

''وہ پانی ملتان گیا، وہ پانی ملتان بہہ گیا یا وہ پانی ملتان آ گیا۔ جس کے معانی یہ ہیں: اب موقع جاتا رہا، وہ بات گئی گزری ہوئی یا ہوگئی۔ وہ بات جاتی رہی، وہ بات اب کوسوں گئی، رات گئی بات گئی، وہ بات ہی نہ رہی۔''

ان تمام وضاحتوں کے بعد ہم اس تلمیح کے پس منظر کی طرف آتے ہیں۔ اس کے پس منظر کے لیے میرے پیش نظر یہ تین ماخذات ہیں۔ خزانہ تلمیحات از محمود نیازی (۲) بھگت کبیر حیات وتعلیمات از ڈاکٹر عبدالحفیظ اور فرہنگ آصفیہ۔

اس تلمیح کا پس منظر یہ ہے کہ ایک دفعہ بھگت گورکھ ناتھ، بھگت ریداس سے ملنے آیا۔ پیاس محسوس ہونے پر جب اُس نے پانی مانگا تو اسے خیال آیا کہ بھگت ریداس ذات کا چمار ہے۔ پس اُسے اِس خیال سے ہی کراہت محسوس ہوئی۔ اُس نے پانی تو بنے میں تو بھر والیا مگر پیا نہیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے پانی پینے کی بات ٹال گیا پھر وہ وہاں سے اٹھ کر بھگت کبیر داس کے پاس چلا گیا اور اُس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوگیا۔ اتفاق سے وہ پانی بھگت کبیر داس کی کمالی نامی بیٹی نے پی لیا۔ پانی پیتے ہی اس پر تینوں لوک روشن ہوگئے (۳)۔ جب بھگت گورکھ ناتھ کو اُس پانی کی صفات معلوم ہوئیں اور اُسے پتہ چلا کہ اس کے پیتے ہی کمالی نے بڑا درجہ حاصل کر لیا ہے تو وہ بہت پچھتایا اور دوبارہ بھگت ریداس کے پاس آ کر پانی مانگا۔ ریداس کو اپنے علم سے معلوم ہوگیا تھا کہ اُس وقت اُس نے اپنے ابھیمان یعنی گھمنڈ کی وجہ سے پانی نہیں پیا تھا۔ اس عرصے میں کمالی کی سسرال والے بنارس

آئے اور اسے ملتان (جہاں اس کی سسرال تھی) لے گئے۔ بھگت ریداس نے بھگت گورکھ ناتھ کی بدقسمتی پر یہ دوہا پڑھا۔

پیاوے تھے جب پیا نہیں تب تم نے یہ ابھمان کیا
بھولا جوگی پھرے دِوانہ وہ پانی ملتان گیا

بھگت ریداس اور بھگت کبیر داس دونوں رامانند کے چیلے تھے۔ تواریخ کی کتب میں کمالی کو بھگت کبیر داس کی بیٹی لکھا گیا ہے مگر اس بات کی صحت میں کلام ہے۔ بھگت کبیر داس اور اس کی بیوی لوئی کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان دونوں کا ایک بیٹا اور بیٹی تھی۔ جب کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بھگت کبیر داس اور لوئی میں زن وشو کا تعلق نہ تھا اور اُن کے یہاں بچوں کا وجود بھی کشف وکرامات کی وجہ سے تھا۔ ایک مرتبہ کبیر نے دریا میں ایک بچے کی لاش دیکھی۔ انہوں نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ بچہ زندہ ہوگیا اور رونے لگا۔ کبیر کے ایک پڑوسی کی لڑکی مرگئی۔ کبیر، والدین کی اجازت سے لاش اپنے یہاں لے آئے، اور اُس کو زندہ کرلیا۔ لوئی نے ان دونوں کی پرورش کی اور یہ کمال اور کمالی کے نام سے مشہور ہوگئے (۴)۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ واقعہ کچھ یوں تھا کہ ایک دفعہ ایک نجومی ایک صاحبِ کمال درویش کے پاس اپنی مراد لے کر گیا۔ درویش کو اس پر رحم آگیا اور اُس نے اُسے اپنا جھوٹا پانی پینے کو دیا۔ نجومی نے کراہت کی وجہ سے وہ پانی نہ پیا۔ اتفاقاً وہیں ایک لڑکی بیٹھی کھیل رہی تھی، جس کی نسبت ملتان میں ٹھہری تھی، وہ درویش کے اشارے پر فوراً پانی پی گئی اور صاحبِ کمال ہوگئی۔ نجومی یہ حقیقت جان کر دوبارہ سوال لے کر آیا۔ اس وقت درویش نے یہ دوہا پڑھا۔

چت کر مانگا ہت کر دیا تیرے من گلیان گیا
بھولا نجومی پھرے دِوانہ وہ پانی ملتان گیا

اِس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ بات جاتی رہی کہ گھر بیٹھے تیری مراد پوری ہوتی تھی۔ اب تو ملتان جا کر تیرا کام بنے تو بنے۔

ڈاکٹر عبدالحفیظ نے اپنی تصنیف ''بھگت کبیر۔۔۔حیات وتعلیمات'' میں بھگت کبیر داس اور کمالی کے حوالے سے اسی قسم کا ایک واقعہ درج کیا۔ اگرچہ اس میں ملتان کا حوالہ تو نہیں ہے مگر یہ واقعہ بھی موضوعِ بحث تلمیح سے مناسبت رکھتا ہے۔

ایک دن کمالی کنویں سے پانی بھر رہی تھی، ایک پیاسے برہمن نے اس سے پانی مانگا، پانی پی کر جب اسے معلوم ہوا کہ کمالی جولاہے کی بیٹی ہے تو وہ بہت ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے بے دھرم کر دیا۔ دونوں بھگت کبیر داس کے پاس آگئے۔ کبیر داس نے برہمن کو بتایا کہ آخر پاک اور ناپاک کیا چیز ہوتی ہے؟ سینکڑوں لاشیں اور منوں پتیاں پانی میں سڑا کرتی ہیں، کروڑوں آدمی زمین میں دفن ہیں اور اسی مٹی سے وہ برتن بنائے جاتے ہیں جن میں تم پانی پیتے اور کھانا کھاتے ہو۔ کھانا کھاتے وقت تم صرف دھوتی باندھے رکھتے ہو۔ وہ دھوتی جلاہے کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ مکھیاں غلاظت اور مردار پر بیٹھتی ہیں اور وہاں سے اُڑ کر تمہارے کھانے پر بیٹھتی ہیں کیا تم اُن کو روک سکتے ہو؟ (۵)

شیخ محمد ابراہیم ذوق نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں اس تلمیحی محاورہ کو برتا ہے۔ شعر دیکھئے

تھا ذوق پہلے دہلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا (۶)

ایک اور جگہ یہ ہی شعر کچھ تبدیلی کے ساتھ یوں بھی آیا ہے۔

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب وتابِ حسن
اے ذوق پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا (۷)

حواشی وحوالہ جات

(۱) "At last, Multan gets the title of "The City of Mangoes", thanks to the municipal Corporation. It was a long standing demand of the people of Multan." (Dawn Nov. 26, 2000)

(۲) خزانۂ تلمیحات، محمود نیازی ملک بک ڈپو، لاہور سن ندارد، ص ۱۰-۹۔

(۳) لوک کا مطلب ہے دنیا، جہان، عالم۔ لوک کی تین قسمیں ہیں:
i۔ سورگ لوک یعنی عالم بالا جہاں دیوتا رہتے ہیں۔
ii۔ مِرت لوک یعنی دنیائے فانی جس میں ہم رہتے ہیں۔
iii۔ پاتال لوک یعنی زیرِ زمین۔

(۴) بھگت کبیر۔ حیات وتعلمات، ڈاکٹر عبدالحفیظ نگارشات، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۴۶۔

(۵) ایضاً ص ۴۶، ۴۷۔

(۶) کلیاتِ ذوق (جلد اول)، محمد ابراہیم ذوق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۶۔

(۷) فرہنگِ آصفیہ، مولوی سید احمد دہلوی، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء،

لغات

(۱) القاموس الجدید (عربی اُردو لغت)، مولانا وحید الزماں قاسمی کرانوی ادارہ، اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۰ء
(۲) جامع اللغات، خواجہ عبدالمجید اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء۔
(۳) فرہنگِ آصفیہ، مولوی سید احمد دہلوی، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء۔
(۴) فیروز اللغات، مولوی فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور، سن ندارد۔
(۵) فیروز اللغات (عربی اُردو)، فیروز سنز، لاہور، سن ندارد۔
(۶) لغات نظامی، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء۔
(۷) نور اللغات، مولوی نور الحسن نیر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔
(۸) ہندی اُردو لغت راجہ راجیسور راؤ اصغر مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء۔
(۹) Arabic-English Dictionary, F. Steingass, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1979.

موپساں ترجمہ: لیاقت جعفری

محبت کا ایک دور

کوٹھڑی کی دیواریں صاف ستھری تھیں اور اُن پر سفیدی بھی کی گئی تھی۔ اِس کوٹھڑی میں ایک تنگ سی کھڑکی بھی نصیب تھی اُس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور اِس کھڑکی کی اونچائی اتنی تھی کہ اُس تک پہنچنا بہت مشکل تھا صرف اِس کھڑکی کی وجہ سے اِس کوٹھڑی میں روشنی آسکتی تھی۔ وہ پاگل آدمی ایک موڑھے پر بیٹھا ہوا تھا اور ہمیں اپنی ڈرادینے والی خالی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ وہ شخص دبلا پتلا تھا، اُس کے گالوں پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور اُس کے تقریباً سفید بال دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ بال چند مہینوں کے اندر سفید ہوگئے تھے۔ اُس کے کپڑے اُس کی کمزور ٹانگوں، سکڑی ہوئی چھاتی اور کھوکھلے بدن پر بہت بڑے لگ رہے تھے۔ اُسے دیکھ کہ آدمی یہ اندازہ لگاسکتا تھا کہ یہ شخص اپنی سوچوں کی وجہ سے تباہ ہوا ہے۔ ایک اسی سوچ کی وجہ سے جیسے کپڑا کسی پھل کو اندر سے کھا جاتا ہے۔ اُس شخص کا پاگل پن، اُس کا تصور، اُس کے ذہن کے اندر موجود تھا۔ یہ تصور ضِدّی، ڈرادینے والا بل کہ نگل جانے والا تھا۔

یہ اُسے آہستہ آہستہ کھائے جارہا تھا۔ اِس غیر مرئی، ناقابلِ محسوس، ناقابلِ گرفت اور غیر مادی تصور نے اُس کا گوشت کھالیا تھا، اُس کا خون پی لیا تھا؛ اُس کی زندگی ختم کر کے رکھ دی تھی۔

یہ کیسا راز ہے کہ ایک خیال، ایک تصور ایک شخص کو مار ڈالے۔ یہ دیوانہ شخص ایک قابلِ رحم وخوف چیز کی طرح لگتا تھا۔ وہ کون سا عجیب وغریب اور دہلا دینے والا خواب تھا، جو اِس شخص کے ماتھے میں گھر کر گیا تھا۔ اِس کی وجہ سے اُس کے ماتھے پر عمیق اور مستقل حرکت پذیر جھریاں ثبت ہوگئی تھیں۔

ڈاکٹر نے مجھ سے کہا: ''اِس شخص پر غصے کے شدید دورے پڑتے ہیں، میں نے اِس جیسا پاگل پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اِس کا پاگل پن عشقیہ اور شہوانی قسم کا ہے۔ یہ ایک طرح سے روحوں سے باتیں کرنے والا لگتا ہے۔ اِس نے ایک ڈائری لکھی ہے جسے پڑھ کر اِس کا ذہنی مرض روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتا ہے، اگر تمہیں دل چسپی ہے تو اِس کی ڈائری پڑھ لو۔''

میں ڈاکٹر کے ساتھ اُس کے کمرے میں گیا وہاں پر ڈاکٹر نے مجھے اِس مظلوم آدمی کی ڈائری دے دی۔

ڈاکٹر گویا ہوا: ''اِس ڈائری کو پڑھو اور مجھے اپنی رائے بھی دو۔'' اِس چھوٹی سی کتاب میں جو کچھ تحریر تھا درج ذیل ہے:

''بتیس سال کی عمر تک میں بغیر کسی محبت کے بڑے آرام اور سکون سے زندہ رہا۔ میرے سامنے زندگی بہت سادہ، خوب صورت اور آسان تھی۔ میں ایک امیر آدمی تھا۔ مجھے بعض چیزوں کا شوق تھا لیکن میں نے کسی خاص چیز کی خاطر کبھی بے قراری محسوس نہیں کی تھی۔ زندگی گزارنا اچھا لگتا تھا۔ میں ہر صبح خوش وخرم اٹھتا تھا اور اپنی مرضی کے کام کیا کرتا تھا، اور جب میں سونے لگتا تھا تو مکمل طور پر مطمئن ہوتا تھا۔ میرے اندر ایک پرسکون اور

بے فکر مستقبل کی اُمید تھی۔

میری چند محبوبائیں بھی تھیں لیکن کسی کے قرب نے میرے دل کو خواہش کی تڑپ اور میری روح کو محبت کا زخم نہ دیا۔ ویسے اِس طرح زندہ رہنا بھی خوب ہے۔ لیکن، اگر انسان محبت کرے، تو خطرناک حد تک کرے، پھر بھی جو لوگ دوسروں کی طرح محبت کرتے ہیں محبت میں مسرت پاتے ہیں لیکن شاید میرے حصے کی مسرت سے محروم رہ جاتے ہیں کیونکہ یہ مجھ پر ناقابلِ یقین انداز سے طاری ہوئی تھی۔

امیر ہونے کی وجہ سے میں نے قدیم فرنیچر اور نوادرات اکھٹے کئے ہوئے تھے۔ میں اکثر اوقات سوچا کرتا تھا کہ وہ کون سے انجان ہاتھ ہوں گے، جنہوں نے ان چیزوں کو چھوا ہوا ہوگا۔ وہ آنکھیں جنہوں نے اِن کی تعریف کی ہوگی، وہ دل جو اِن سے پیار کرتے ہوں گے کیوں کہ آدمی ایسی اشیاء سے محبت ہی کرتا ہے۔ میں گھنٹوں ایک گھڑی کو تکتا رہتا تھا، یہ گھڑی گذشتہ صدی کی بنی ہوئی تھی۔ یہ بہت نازک اور بہت خوبصورت تھی اِس پر سونے سے کندہ کاری کی گئی تھی، اور یہ اُس دن سے چل رہی تھی جب کسی خاتون نے اِس کو خریدا ہوگا اور وہ اِس حسین زیور کو اپنے پاس رکھ کر خوش ہوئی ہوگی۔ ایک صدی گزرنے کے باوجود اِس گھڑی نے کبھی بھی ڈھڑکنا بند نہیں کیا اور اپنی میکانکی زندگی جاری رکھی ہوگی۔ اِس نے اپنی باقاعدہ ٹک ٹک جاری رکھی ہوگی۔ کس قوت نے پہلے پہل اِس گھڑی کو اپنی چھاتی پر سجایا ہوگا، اپنے پیرہن کی نرمیلی حِدّت اِس کو دی ہوگی اور اِس گھڑی کا دِل اُس کے دل کے ساتھ ساتھ دھڑکا ہوگا۔ کس ہاتھ نے اِسے اپنی گرم انگلیوں سے تھاما ہوگا۔ اِس کے رنگ کو صاف کیا ہوگا اور کس جلا کی نمی سے اِس کا رنگ میلا پڑا ہوگا۔ وہ کون سی آنکھیں ہوں گی جنہوں نے اِس گھڑی کے گل رنگ ڈائل کو تکتے تکتے حسین اور مقدس لمحۂ وصال کا انتظار کیا ہوگا؟

میں کس طرح اُس حسینہ کو دیکھنا چاہتا تھا اور اُس سے ملنا چاہتا تھا جس نے اِس شان دار اور نادر چیز کا انتخاب کیا ہوگا لیکن وہ تو مر چکی تھی۔ میں گذرے وقتوں کی عورت کی خواہش میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ میں اُن تمام لوگوں سے محبت کرتا ہوں جنہوں نے گئے زمانوں میں مشق کیا ہوگا۔ ماضی کو نازک کہانی میرے دل کو پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ آہ! حُسن، مسکراہٹیں بوسے؛ جوانی کے، امیدوں کے۔ یہ چیزیں تو لافانی ہونی چاہئیں!

میں کس طرح تمام راتوں میں پرانے دور کی عورت پر روتا رہا ہوں۔ اتنی خوب صورت اتنی نازک، اتنی شیریں؛ جس کے ہونٹ بوسے کیلئے کھلتے ہوں گے، وہ ہونٹ مر چکے ہیں لیکن بوسہ لافانی ہے۔ یہ بوسہ ہونٹ سے ہونٹ تک چلتا ہے، صدی سے صدی تک جاتا بل کہ ایک عہد سے دوسرے عہد تک کا سفر کرتا ہے۔ انسان بوسہ لیتے ہیں اور بوسہ دیتے ہیں پھر مرجاتے ہیں۔

ماضی مجھے اپنی جانب کھینچتا ہے، موجودہ زمانہ مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے کیوں کہ مستقبل کا نام موت ہے۔ میں اُس سب کچھ پر پچھتاتا ہوں جو گزر چکا ہے، میں اُن لوگوں پر روتا ہوں جو اپنی اپنی زندگیاں کر چکے ہیں۔ میں وقت کو روکنا چاہتا ہوں، اُسے گرفتار کرنا چاہتا ہوں، مگر یہ چلتا رہتا ہے، چلتا رہتا ہے، گزر جاتا ہے اور لمحہ لمحہ مجھے مجھ سے چھینتا رہتا ہے اور کل کی تباہی کی خاطر میرا کچھ حِصّہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور یہ کہ میں کبھی بھی دوبارہ زندہ نہیں ہوسکوں گا۔

الوداع! عہدِ گذشتہ کی عورت، میں تمہیں چاہتا ہوں۔

اور پھر بھی مجھے کسی شے سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں نے اُسے پالیا ہے، جس کا مجھے انتظار تھا اور اُس کے ذریعے میں ایک ناقابلِ بیان خوشی کی لذت سے آشنا ہوا ہوں۔

ایک روشن صبح کو میں پیرس میں خوشی خوشی گھوم رہا تھا میں روح تک خوش تھا اور میں راہ گیروں کی سی بے معنی دل چسپی سے دکانوں کے اندر دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے نوادرات کی دکان میں سترھویں صدی کا اطالوی فرنیچر دیکھا۔ یہ بہت نادر اور بہت خوب صورت تھا۔ میں نے اِس کو اِس کے عہد کے وینیشین فن کاروی ٹے لی سے منسوب کر دیا پھر میں آگے بڑھ گیا۔

اِس فرنیچر کی یاد نے اتنی شدت سے میرا پیچھا کیوں کیا کہ میں اپنے پچھلے قدموں پر مڑ گیا۔ میں دوبارہ اُس دکان پر رُک گیا اور مجھے ایسا لگتا کہ جیسے یہ فرنیچر مجھے خریدنے پر اکسا رہا ہے۔ یہ خواہش بھی کیا چیز ہے! جب آپ کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ آپ کو ورغلا لیتی ہے، آپ کو تنگ کرتی ہے، آپ پر کسی عورت کے چہرے کی طرح غلبہ پا لیتی ہے، اِس کا جادو آپ کے اندر سرایت کر جاتا ہے؛ یہ عجیب طلسم، اُس چیز کے رنگ، حالت اور طبیعی شکل سے پیدا ہوتا ہے۔ انسان فوراً اُس سے پیار کرتا ہے اور اُس کی خواہش کرتا ہے۔ اُس شے کی ملکیت کی ضرورت آپ پر غالب آجاتی ہے۔ ابتداً یہ ضرورت خوش گوار اور مہین ہوتی ہے لیکن بڑھتے بڑھتے یہ شدید ہو جاتی ہے اور انسان اِس کو روک نہیں پاتا اور یہ تاجر لوگ آپ کی آنکھوں سے اِس راز کو اِس بڑھتی ہوئی خواہش کو پڑھ لیتے ہیں۔ میں نے وہ فرنیچر خرید لیا اور اُسے اپنے گھر لے آیا۔ میں نے اُسے اپنے کمرے میں جگہ دی۔

اوہ! مجھے اُن لوگوں پر ترس آتا ہے جو کہ نوادرات اکھٹا کرنے والوں کی اُس خوشی تک سے بے خبر ہیں جب وہ ایک چھوٹا سا نادر زیور خریدتا ہے۔ وہ اُسے اپنی نگاہوں اور ہاتھوں سے اس طرح سہلاتا ہے، جیسے وہ گوشت پوست کی چیز ہو۔ وہ شخص اُسی شے کو اس کا گزرا ہوا کل لوٹا دیتا ہے۔ مسلسل اُس کے بارے میں سوچتا ہے حتیٰ کہ اپنے معمولات میں بھی اُسے یاد کرتا رہتا ہے۔ اُس شے کا تصور اُسے گلیوں میں اور بازاروں میں بھی رہتا ہے اور جب وہ گھر لوٹتا ہے تو دستانے اتارنے سے پہلے ایک عاشق کی طرح اپنی نظریں اُس شے پر نچھاور کر دیتا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں آٹھ دنوں تک اپس فرنیچر کو سہلاتا رہا۔۔۔ میں اس کی درازیں اور دروازے کھولتا رہتا تھا۔ میں اُسے پیار سے چھوتا تھا اور مسرتِ ملکیت کی تمام مانوس خوشیوں کے ذرائع سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

ایک شام کو میں اُسے دیکھ رہا تھا کہ اُسکے ایک حصے کو قدرے دبیز محسوس کیا مجھے خیال آیا کہ شاید یہاں پر کوئی شے چھپانے کی جگہ بنائی گئی ہوگی۔ میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا۔ اگرچہ میں کامیاب نہ ہوا لیکن تمام رات اِس راز کو کھوجنے میں صرف کر ڈالی۔

دوسرے روز میں نے دھات کا ایک ٹکڑا اُس کے تختے کے شگاف میں ڈال دیا۔ شیلف پھسل گئے میں نے دیکھا کہ سیاہ مخمل کی ایک دھاری سی ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو شان دار زلفوں کا ایک گچھا ہے۔ وہ زلفیں جو کبھی کسی خاتون کا حصہ رہی ہوں گی۔ ہاں زلفوں کا ایک گچھا، بل کہ خوب صورت سرخ چٹیا، اُسے جلا کے

پاس سے کاٹا گیا تھا اور سونے کی تار میں باندھ دیا گیا تھا۔

میں حواس باختہ ہو گیا اور پریشانی سے کانپنے لگا۔ مجھے ایک مُبہم خوش بو محسوس ہوئی اتنی پرانی خوش بو کہ جیسے خوش بو کی روح، یہ خوش بو اِس پراسرار دراز اور اِس حیران کن تبرک سے اُٹھ رہی تھی۔

میں نے آرا سے بلکہ مذہبی عقیدت سے اُسے اٹھالیا۔ اچانک یہ کھل گئی جس کے وجہ سے تمام بال، ہلکے اور بھاری، لچک دار اور چمکیلے؛ کسی دم دار ستارے کی آتشی دم کی طرح فرش پر بکھر گئے۔

ایک عجیب سے جذبے نے مجھے جکڑ لیا۔ یہ زلفیں کس حسینہ کے جسم کا حصہ رہی ہوں گی؟ کب؟ کن حالات ہیں؟ انہیں فرنیچر کے اِس حصے میں کیوں چھپا دیا گیا؟ کون سی مُہم، کونسا ڈراما؛ اِس یادگار سے منسلک تھا؟ کس نے اِن زلفوں کو کاٹا ہوگا؟ کسی عاشق نے جدائی کے وقت؟ کسی شوہر نے بدلے کے وقت؟ یا غالباً کسی عورت نے بہ ذاتِ خود شاید اُس وقت جب وہ نا امید ہو گئی ہوگی۔ شاید برآمدے میں داخل ہوتے وقت اپس عورت نے محبت کا یہ خزانہ رہتی دنیا کے لیے نشانی کے طور پر چھوڑا ہوگا؟ یا شاید وہ عورت مر گئی ہوگی اور قبر بند ہونے سے پہلے اُس کے عاشق نے اِس حسین عورت کے بال لے لئے ہوں گے کیوں کہ اُس کی یہی چیز محفوظ کی جاسکتی تھی، اُس کے جسم کا واحد حصہ جو کبھی فنا نہیں ہوگا یہی وہ چیز ہوگی، جسے وہ اپنے غم کی حالت میں سہلاتا ہوگا اور چومتا ہوگا۔

کیا یہ عجیب و غریب بات نہیں ہے کہ اُس عورت کے جسم کا کوئی حصہ بھی سلامت نہیں اور اُس کی زلفیں ویسی کی ویسی پڑی ہوئی ہیں۔ یہ زلفیں میری انگلیوں کے گرد لپٹی ہوئی تھیں اور میری جلد کو ایک خاص لمس پہنچا رہی تھیں، حدت کا لمس۔ میں اِس سے بہت متاثر ہوا، مجھے ایسا لگا جیسے میں رو دوں گا۔

میں نے بہت دیر تک اِس لٹ کو اپنے ہاتھوں میں رکھا، تب مجھے ایسا لگا جیسے یہ مجھ پر اثر کر رہی ہو۔ ایسے جیسے اِس لٹ میں روح کا کچھ حصہ رہ گیا ہو۔ میں نے اُسے مخمل پہ رکھ دیا، دراز بند کر دی اور خواب دیکھنے کی خاطر گلی کی راہ لی۔ میں سیدھا چل پڑا مکمل طور پر اُداس اور تکیف دہ دل کے ساتھ ایک ایسی تکلیف اور اذیت جو محبت کے بوسے کے بعد رہ جاتی ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے میں پرانے وقتوں میں زندہ تھا اور اُس عورت کو جانتا تھا۔

اور میرے ہونٹوں پر وِلان Villon کے اشعار سسکیوں کے ساتھ آنے لگے

کوئی تو ہو جو مجھے بتائے
کہ دورافتادہ سرزمیں ہے کہاں جہاں پر
فلورا رہتی ہے حسنِ روما
کزن وہ تھائیس کی نام جس کا پیار کیا ہے
جہاں فطرت اپنا تمام تر حسن لٹا دیتی ہے۔
جہاں گونج گفتگو کرے، آواز جاگ جائے
دریا پر، ندی پر، جھیل کہاں؟
حسن کی مسکان اور حسن کے آنسو کہاں ہیں؟
اور گزرے برسوں کی برف کہاں ہے؟

بینکی گل سوسن کی طرح حسین،
شیریں گلو کا راپنی مقدس آواز کے ساتھ
Alice, Beatrice, Bertha Broadfoot
Lemaynes, Emengade کی خوب صورت ملکہ
(Joan) جَون کہاں ہے؟ پیارے لورین کہاں ہے؟
جسے انگریزوں نے مار ڈالا ہے؟
اے دانا لوگو! بتاؤ یہ سب کہاں ہیں؟
اور گزرے برسوں کی برف کہاں ہے؟

جب میں واپس آیا تو مجھے پھر یہ خواہش ہوگی کہ اپنے عجیب وغریب خزانے کو دوبارہ دیکھوں۔ میں نے اُسے اُٹھایا اور محسوس کیا اور اُسے چھوتے ہی میرے جسم میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔

تاہم، چند دن تک میں عام حالت میں رہا لیکن ان زلفوں کا خیال ہر دم میرے ساتھ رہا۔ جب کبھی میں گھر آتا تو سب سے پہلے انہیں دیکھتا اور چھوتا۔ جب میں دراز کی چابی گھماتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں اپنی محبوبہ کے گھر کے دروازے کی چابی گھما رہا ہوں۔ کیوں کہ میرے دونوں ہاتھوں اور دل میں ایک پریشان کن، مسلسل، حِسی ضرورت پیدا ہوگئی تھی کہ میں مردہ بالوں کا اِس لٹ میں اپنی انگلیاں دفن کردوں۔

جب میں اِسے سہلانا ختم کرتا اور اِسے دوبارہ اِس کی آرام گاہ پر رکھ کر لوٹتا مجھے لگتا کہ جیسے اپس جگہ پر کوئی زندہ شے ہے جسے بند کر دیا گیا ہے یا قید کر دیا گیا ہے۔ میں نے اِس کا لمس محسوس کیا بل کہ اِس کی خواہش کی اور مجھے اِس کو چھونے کی شدید ضرورت محسوس ہوتی تھی اور میں اپنے آپ کو تھکا دینے کی حد تک اُس سرد، چمک دار، پریشان کن اور شان دار زلفوں کی لٹ سے کھیلتا رہتا تھا۔

اِس طرح مجھے ایک دو مہینے گزر گئے۔ میں نہیں جانتا کہ کب تک یہ چیز مجھ غالب رہی۔ میں بہ یک وقت خوش اور دکھی تھا۔ جیسے محبت کی توقع میں کوئی آدمی کسی محبوبہ کو بانہوں میں لینے سے پہلے اعتراف کرتا ہے۔

میں اِس لٹ کو لے کر اکیلا بند کمرے میں ٹہرا رہتا تھا اِس کو اپنی جلا پر پھیرتا تھا اپنے ہونٹ اِس میں دفن کرتا تھا اپنے چہرے پر پھیرتا اور اِسے کاٹتا رہتا۔ حتیٰ کہ پانی اِسی میں پیتا۔ اِس کی سنہری لہروں میں اپنی آنکھیں غرق کر دیتا اور اِس کی گذشتہ دنیا تک دیکھ لینا۔

میں اِس سے پیار کرتا تھا ہاں میں اِس سے پیار کرتا تھا۔ میں اِس کے بغیر مزید زندہ نہیں رہ سکتا تھا یا ایک گھنٹہ اِس سے جدا نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے انتظار تھا، مجھے انتظار تھا کس کا؟ میں اُس عورت کو نہیں جانتا!

ایک رات میں اچانک جاگ گیا مجھے ایسا لگتا کہ جیسے میں کمرے میں تنہا نہیں ہوں لیکن میں تو اکیلا تھا، پھر میں دوبارہ نہ سو سکا اور جب میں بے خوابی کی حالت بستر پر لوٹ رہا تھا، میں نے زلفوں کی لٹ کو اٹھایا اور اُسے دیکھتے تک گیا۔ یہ مجھے شیریں تر اور زیادہ جان دار لگنے لگی۔

کیا مردہ لوگ لوٹ سکتے ہیں؟ وہ آ گئی ہاں! میں نے اُسے دیکھا، اُسے چھوا، اُسے اپنے پاس رکھا؛ وہ اُسی طرح بھی، جیسے وہ گزرے وقتوں میں ہوگی۔ بڑی، نرم اور گداز، ٹھنڈی چھاتیاں تھیں اور اس کے کولہے قدیم

یونانی بربط کی طرح تھے اور میں نے اُسے گلے سے لے کر پاؤں تک چوما جسم کے ہر موڑ کو بوسے دیئے۔

ہاں! ہر روز اور ہر رات میں، اُس کا مالک ہوتا تھا۔ وہ لوٹ چکی تھی۔ موت، خوب صورت موت، محبت کے قابل، وہ پراسرار، وہ اجنبی؛ وہ ہر رات لوٹتی تھی۔

میری خوشی اِس قدر زیادہ تھی کہ میں اُسے چھپا نہ سکا۔ میں اُس کے قرب میں ایک غیر انسانی مسرت محسوس کرتا تھا اور اِس ناقابلِ گرفت غیر مرئی موت شاد مانی نصیب ہوئی۔ کسی عاشق نے میری طرح شدید اور خطرناک خوشیاں نہیں دیکھیں۔

میں اپنی خوشی کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ میں اُسے اتنا چاہتا تھا کہ اُسے اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔ میں زلفوں کی اِس لٹ کو ہر وقت، ہر جگہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ شہر میں، تھیٹر میں، ریستورانوں میں ہر جگہ اپنی بیوی کی طرح ساتھ رکھتا تھا لیکن اُن لوگوں نے اِسے دیکھ لیا اور اندازہ کر لیا۔ اُنہوں نے مجھے پکڑ لیا اور لا کر جیل میں ڈال دیا۔ کوئی مجرم ہوں اور وہ اُسے مجھ سے چھین کر لے گئے۔

آہ! بدقسمتی!''

یہ تحریر یہاں ختم ہوگئی اور جیسے ہی میں نے آنکھیں اُٹھا کر حیرانی سے ڈاکٹر کی جانب دیکھا، ایک چیخ، غصے کی چنگھاڑ سنائی دی اور اس خوف ناک آواز نے تمام عمارت کو ہلا دیا۔

''سنو!'' ڈاکٹر نے کہا۔ اِس عجیب وغریب پاگل کو دن میں پانچ مرتبہ پانی میں ڈبکیاں دینا پڑتی ہیں۔ یہ صرف ''سرجنت برتراں'' ہی ہے کہ جو مُردوں کے عشق میں مبتلا ہوا ہے۔

میں کانپ گیا، مجھ پر خوف، رحم اور حیرانی کا شدید اثر ہوا تھا۔ میں نے پوچھا: ''لیکن کیا واقعی وہ زلفوں کی لٹ اُس کے پاس موجود تھی؟''

ڈاکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اوزاروں سے بھری ایک الماری کھولی اور میری جانب ایک لمبا نسوانی بالوں کا گچھا اچھال دیا۔ وہ میری جانب سونے کے کسی پرندے کی طرح اڑتا ہوا آیا۔

میں اُس کا لمس پا کر کانپ اُٹھا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ میرا دل نفرت اور خواہش سے دھڑکنے لگ گیا۔ یہ نفرت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم جرائم سے وابستہ چیزوں کو دیکھتے ہیں اور خواہش اِس قسم کی کہ جو کسی پر اسرار چیز کو آزمانے کی خاطر پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا:

''انسانی ذہن میں سب کچھ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔''

❋ ❋ ❋

تبصرہ نگار: ڈاکٹر شگفتہ حسین

کتابوں پر تبصرہ

۱۔ سرسید احمد خان اور جدت پسندی/ ڈاکٹر محمد علی صدیقی

کسی بھی زبان کا اعلیٰ ادب اس وقت تخلیق ہوتا ہے جب اس میں متعین مدار سے نکلنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے لیکن آئین نو سے ڈرنے اور طرزِ کہن پر اڑنے والا روایت پرست معاشرہ مدار سے نکلنے والے باغی کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال سرسید احمد خان کو پیش آئی۔ ہوا کے رُخ کو پہچان کر اپنا رُخ بدلنے کا رویہ ان کے عہد کو قبول نہ تھا چنانچہ ان کی مصلحت پسندی کو انگریزی حکومت سے وفاداری کا نام دے کر انہیں معتوب ٹھہرانے کی کوشش کی جاتی رہی۔

''سرسید احمد خان اور جدت پسندی'' ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تصنیف ہے، جس میں مختلف مضامین کے ذریعے سرسید کے نظریات کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر حسن اختر کی ایک تحریر کبھی نظر سے گزری تھی جس میں ڈاکٹر حسن اختر کو اُردو تحقیق کے زوال کی وجہ یہ سمجھ آئی تھی کہ ہم میں چونکہ جرأت، سچائی اور محنت کی کمی ہے لہٰذا ہم صحیح معنوں میں تحقیق کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں اور یہ بھی کہ ہمارا کردار ہماری تحقیق اور تنقید میں جلوہ گر ہوتا ہے لیکن صدیقی صاحب نے ڈاکٹر حسن اختر کا یہ گلہ یقیناً ختم کر دیا ہے کہ ان کی کتاب، جرأت، سچائی اور محنت تینوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سرسید کی شخصیت اپنے عہد کی متنازعہ شخصیت رہی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی دُور بین نگاہیں جس منظر نامے کا جائزہ لے رہی تھیں مخالفین مخالفت کے جوش میں اس کا تصور کرنے سے بھی عاری تھے۔ یوں تو یہ صرف ہماری مٹی کا ہی المیہ نہیں کہ گل محمد کے پیروں کو جکڑ لیتی ہے لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب وہ لوگ، جنہیں آپ اپنے دور کے مجتہدین میں شمار کرتے ہیں، وہ بھی غیر حقیقت پسندانہ رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں مثلاً سید جمال الدین افغانی فری میسن لاج کے ممبر تھے اور جدید تہذیب کے بہت بڑے داعی، اس اعتبار سے تو وہ سرسید سے زیادہ جدید تھے لیکن وہ بھی سرسید احمد خان کو ''نیچری فرقے'' کا بانی قرار دے کر مخالفت اور تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں جب کہ اس فری میسن لاج سے خود ان کے تعلق پر کوئی حرف زنی نہیں کرتا۔ صدیقی صاحب نے اپنے پہلے مضمون ''عالمِ اسلام میں جدت پسندی کی تحریک اور سرسید احمد خان'' میں نہ صرف سرسید پر مولانا افغانی کے اعتراضات کو دلیل سے رَد کیا ہے بلکہ ترکی، مصر اور شام کے جدت پسندوں کی مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ انہی کی طرح سرسید بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اسلام اور جدیدیت ایک دوسرے کے نقیض نہیں بلکہ ایک دوسرے کو طاقت ور بناتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک عام روایت لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے یا دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی بھی رہی ہے۔ سرسید پر بھی تکفیر کا فتویٰ جاری ہوا۔ ناسمجھی کا یہ عالم تھا کہ ناظم دیوبند مولانا رشید گنگوہی نے اپنے ایک مرید کے استفسار پر باقاعدہ یہ فتویٰ بھی جاری کیا کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت جائز ہے لیکن

سرسید، خواہ وہ کوئی کام بھلائی کا ہی کیوں نہ کرے، اس سے تعلق رکھنا سمِ قاتل ہے۔ صدیقی صاحب کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ علماء کانگریس سے تعلق رکھنا چاہتے تھے اور سرسید اس شرکت کے خلاف تھے۔ سرسید کو ''دہریت'' کی تہمت اپنی تفسیر قرآن کی وجہ سے بھی اُٹھانا پڑی۔ وہ ''جدید علوم و کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید'' کو قرار دیتے ہیں اور اس کے سوا تمام ''مجموعہ ہائے احادیث'' کو کہ ان میں کوئی حدیث ''مثل قرآن کے قطعی الثبوت'' نہیں اپنی بحث سے خارج کر دیتے ہیں۔ صدیقی صاحب نے یہاں عقل مندی سے کام لیتے ہوئے سرسید کی اس رائے کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ''یہ معاملے ہیں نازک جو تیری رضا ہو تو کر'' کے مصداق خاموشی سے گزرنا ہی بہتر تھا۔ ایسا ہی ایک اور نازک موضوع حرمتِ سود سے متعلق ہے۔ سرسید شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کے مطابق انگریزی بنکوں سے سود لینے اور دینے کے قائل تھے۔ صدیقی صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے ''اپنی تفسیر میں حرمتِ سود کا اطلاق کھاتے پیتے اور مرفع الحال حضرات پر کیا ہے۔ وہ ایمانداری کے ساتھ اس موقف کے حامی تھے کہ شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کے مطابق انگریزی بنکوں سے سُود پر رقمیں لی جا سکتی ہیں اور ان بنکوں سے سود لینا اور انہیں سود دینا غلط نہیں ہے، وہ ایک طرح سے مسلم ہندوستان کے لیے لُوتھر (Luther) بن گئے۔'' وقت اور حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ سرسید کے مذہبی خیالات کی آپ لاکھ آج بھی مخالفت کریں لیکن سودی معیشت کے بارے میں ان کا نظریہ اور مسلمانانِ ہند کی معاشی پس ماندگی کے تجویز کردہ دو اہم اسباب جدید تعلیم کا فقدان اور حرمتِ سود پر اصرار، درست تھے۔

سرسید ہندوستان میں تجدد پسندی کی تحریک کے پیش رو تھے لیکن مقام حیرت ہے کہ وہ مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کو ہیچ سمجھنے کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کے بھی حامی نہ تھے۔ انتقال سے صرف چند ماہ قبل خواتین کے لیے اسکول کھولنے پر رضامند ہوئے۔ صدیقی صاحب نے سرسید کی جدت پسندی کے بیشتر پہلوؤں کو تو لیا ہے لیکن سرسید کی اس ''رجعت پسندی'' کی وضاحت نہیں کی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ چند سطروں میں ہی سہی اپنی تحقیق کی روشنی میں کچھ اس کی بھی وضاحت کر جاتے۔ اس لیے کہ آپ مانیں نہ مانیں ہمیں تو یہ بات بہت کھلتی ہے کہ وہ طبقہ جو کسی بھی قوم کی ترقی میں بنیاد کا کام دیتا ہے اس کے بارے میں سرسید سا روشن خیال، تجدد پسند اپنے عہد کے دیگر رجعت پسندوں کی طرح ردِعمل کا اظہار کرے۔ سرسید کی شخصیت کا یہ Paradox خاصا دلچسپ بھی ہے اور تحقیق طلب بھی۔ یقیناً سرسید کی اس رجعت پسندی کی کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہوگی۔ اسی طرح مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی مخالفت کا بھی کوئی جواز ضرور ہوگا کیونکہ مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کے مقابلے میں سرسید انگریزی تعلیم کے اس قدر حامی تھے کہ انگریزوں کے ایجنٹ قرار پائے۔ اس میں ویسے شبہ نہیں کہ سرسید نے انگریز سے وفاداری نبھائی اور خوب نبھائی لیکن ایک سرسید ہی پر کیا منحصر، بے شمار ایسے رؤسا، نوابین اور علماء کی مثالیں موجود ہیں جن کے انگریزی حکومت سے لائق توجہ خصوصی تعلقات تھے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں تو سرسید کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں۔ پیغمبر اسلام کے بارے میں مستشرقین کی ہرزہ سرائی کا مدلل جواب جس انداز سے سرسید نے دیا، وہ انداز تو مولانا افغانی کو بھی میسر نہ ہوا۔ اپنی بے شمار خدمات، ادبی، علمی، مذہبی اور فکری کے باوجود اگر آج بھی سرسید کو ہدفِ تنقید بنانا آسان ہے یا ان کے دفاع کی ضرورت ہے تو شاید اس لیے کہ پاکستان بننے کے بعد ''قومی'' کا لاحقہ لگا کر انہیں کسی منبر پر نہیں بٹھایا گیا۔ علامہ اقبال بھی صدیقی صاحب کی پسندیدہ شخصیت ہیں کیونکہ سرسید کی

طرح وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جدید علوم معرفتِ الٰہی میں معاون ثابت ہوتے ہیں نہ کہ اس کی راہ میں مزاحم لیکن صدیقی صاحب اقبال کی جدت پسندی کا ذکر کرتے ہوئے اس نظم کا بھی ذکر کرتے ہیں جس میں اقبال نے جنگِ عظیم دوئم میں انگریز فوجوں کی بھرتی کی مہم میں حکومت وقت کی حمایت کی تھی اور ''اہلِ وفا کی نذرِ محقر قبول'' کرنے کی درخواست کی تھی۔ اسی طرح صدیقی صاحب نے ان کی اس نظم کا بھی حوالہ دیا ہے جو اقبال نے سر مائیکل اوڈائر کی مدح میں لکھی تھی (پیسہ اخبار، ۵ مئی ۱۹۱۸ء)۔ تاریخ کے طالبِ علم جانتے ہیں کہ یہ سر مائیکل اوڈائر اس زمانے میں پنجاب کا لیفٹننٹ گورنر تھا اور اس نے سانحہ جلیانوالہ باغ کے ''کامیاب ہیرو'' جنرل ڈائر کے اقدام کو سراہا تھا اور اسے انعام سے نوازا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں اقبال نے سر کا خطاب بھی قبول کر لیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ آپ میں سے بہت سے قارئین ان باتوں سے مکمل واقفیت رکھتے ہوں، لیکن میرے لیے کم از کم نیا ہے کہ اقبال نے یوں وفاداری نبھائی ہو۔ عام طور پر اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں بہت محتاط رہنا ہوتا ہے کیونکہ ایسی باتوں کا ردِ عمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ گو یہ ردِ عمل زندگی کی حرارت اور محبت کی گواہی ہے اور ردِ عمل صرف کسی ایک شعبہ سے نہیں آتا، لیکن ادیب کا کام ذرا زیادہ ذمہ داری کا تقاضا کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے سرسید کی مذہبی فکر اور سیاست، انگریزی حکومت اور مسلم مفادات، سرسید اور ان کے رفقا کے تصورِ علم اور رسالہ تہذیب الاخلاق کے مضامین کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ اکبرالہ آبادی کے سرسید سے اختلافات اور پھر اتفاق، شبلی اور اقبال کی سرسید سے مماثلتیں بھی بیان کی ہیں۔ آخر میں ۷ ضمیمے ہیں جن میں سرسید کا مقالہ ''ڈاکٹر ہنٹر کی غلط فہمیوں کا ازالہ'' اور ''علی گڑھ کالج کے یوم تاسیس پر روز نامہ پائنیر کا تعارفی مضمون'' بھی شامل ہے۔

تحقیق میں کوئی بات بھی حرفِ آخر نہیں ہوتی اور اس اعتبار سے صدیقی صاحب کی کتاب تحقیق کے کئی ایک در وا کرتی ہے۔ ایک کی طرف تو خود انہوں نے بھی اشارہ کیا ہے یعنی سرسید اور اکبرالہ آبادی کے اختلافات پر تو بہت لکھا گیا لیکن اکبرالہ آبادی کے ''ممدوح سرسید'' کی ایسی دھوم نہیں۔ کیوں؟

> ''مقامِ حیرت ہے کہ اکبرالہ آبادی پر بعض لکھنے والوں نے سرسید احمد خان اور ان کی تحریک کے بارے میں استہزائی اشعار پر جس قدر زور دیا اگر وہ اس سے نصف زور اکبرالہ آبادی کے موقف میں تبدیلی پر بھی دے دیتے تو اس سے سرسید احمد خاں کے موقف کی پذیرائی کے کچھ اور پہلو بھی سامنے آسکتے تھے۔''

ڈاکٹر صاحب کی دوسری تحریروں کی طرح یہ کتاب بھی ان کی روشن خیالی اور ترقی پسندانہ سوچ کا اظہار ہے۔ سرسید پر لکھے تمام مضامین ہمیں بحث کی دعوت دیتے ہیں اور یہ بھی کہ پھر جو Synthesis سامنے آئے اسے ہم قبول بھی کر لیں کیونکہ صحت مند معاشرے کا چلن یہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ابلاغ کے قائل، آمریت کے مخالف اور ایک ترقی پسند سوچ کے حامل معاشرے کی تشکیل کے خواہاں ہیں، جہاں مخالفت برائے مخالفت اور رجعت پسندانہ قوانین کا راج نہ ہو۔

آخر میں انہی کی بات سے اتفاق کروں گی کہ اگر آج سرسید ہمارے درمیان موجود ہوتے تو ہمارے سماج میں جدید تعلیم کے فروغ پر بہت خوش ہوتے لیکن متاسف بھی ضرور ہوتے کہ ابھی تک ہمارے پیراہنِ فکر

میں رفو کا کافی کام باقی ہے۔

مسیحا چیختا پھرتا ہے ہر گلی میں
مگر اس پر بھی بیماری بہت ہے

۲۔ سوشلزم اور عصری تقاضے / ڈاکٹر خیال امروہوی

ڈاکٹر خیال امروہوی صاحب سے میرا پہلا تعارف ''سوشلزم اور عصری تقاضے'' ہے اور یہ پہلا تعارف اس اعتبار سے بے حد خوش کن ہے کہ وہ لیہ جیسے شہر میں بیٹھے ترقی پسندانہ فکر کی اشاعت و ترویج میں مصروف ہیں۔ ٹھہرے پانی جیسی سوچ رکھنے والوں سے اپنی تو ویسے بھی نہیں بنتی۔

ہمارے ہاں عام رویہ یہ ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم ایک ہی ازم کے دو نام ہیں اور جو شخص بھی سوشلزم کی بات کرے اسے دائرۂ اسلام سے فوری خارج قرار دے دیا جاتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ایک تو عام لوگ ہی نہیں اپنے تئیں بہت پڑھے لکھے لوگ بھی سوشلزم کی صحیح تعلیمات سے آگاہ نہیں دوسرے سوشلزم ایسا نظامِ زندگی ہے جو سرمایہ داری نظام اور آمریت کے قطعی برعکس ہے، جب کہ آمریت ہو یا سرمایہ داری ہر دو صورتوں میں محنت کش طبقے کے استحصال کے لیے سرمایہ دار، آمر مطلق اور مُلا تینوں ایسی ٹرائیکا بناتے ہیں کہ ایک دوسرے کو باقاعدہ تحفظ دیتے ہوئے عوام کو اپنا غلام بنائے رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر خیال امروہوی کے کہنے کے مطابق انہوں نے اس کتاب کے مضامین کو ۱۹۸۰ء میں لکھنا شروع کیا اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ سوشلزم اور آئندہ اس کے ارتقاء کے بارے میں آسان زبان میں کتاب لکھی جائے۔ گویا اس کتاب کے آغاز کا زمانہ وہی ہے جب پاکستانی قوم پر ہماری تاریخ کے سیاہ ترین مارشل لاء کا آسیب مسلط تھا، ایک بار پھر آمر مطلق، سرمایہ دار اور مُلا تینوں کا گٹھ جوڑ لوگوں کے لیے ایک عذاب بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس عذاب کا ذکر تو نہیں کیا لیکن وہ بار بار ایک جملہ دہراتے ہیں ''پاکستان کی تشکیل ملائیت کی بنیادوں پر نہیں ہوئی''، ''پاکستان ملائیت کے لیے نہیں بنا''، ''پاکستان ملائیت کے نام پر نہیں بنا تھا''۔ اس تکرار سے مصنف اور ملا کے درمیان شدید مخاصمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے سارے ترقی پسندوں کا ہے، وہ ملائیت کے ساتھ تعاون کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے ہیں اور اسی لیے ہر ترقی پسند ہر سوشلسٹ، ملا کی نظر میں کافر اور ملحد قرار پاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک موضوع تصورِ بیگانگی ہے۔ انہوں نے مارکسی نقطۂ نظر سے اس عوامی بیگانگی کے اسباب بیان کیے ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کو ہر دور میں پامال کیا جاتا رہا ہے اور حقوق کی پامالی جب حد سے بڑھ جائے تو انسان اکتاہٹ اور بے زاری میں مبتلا ہو کر خود اپنی ذات اور دوسروں سے بھی بے گانہ ہو جاتا ہے۔ ازل سے زندگی کو محبوس کرنے والی قوتیں انسان کے گرد گھیرا تنگ کرتی رہی ہیں کبھی وہ ان قوتوں کے سامنے شکست تسلیم کر لیتا ہے اور ازلی و ابدی تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے اور کبھی ان سے ٹکرا کر اپنے حقوق کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔ کارل مارکس کا کہنا ہے کہ جب مزدور یا محنت کش اپنی بنائی چیز سے فائدہ نہیں اُٹھاتا تو اپنی محنت سے بے گانہ ہو جاتا ہے اور جب وہ طبقاتی سماج کا شکار ہوتا ہے تو دوسرے انسانوں سے بھی کٹ جاتا ہے۔ پاکستان کا محنت کش بھی

بیگانگی کے اس عذاب میں مبتلا ہے، لہٰذا اس سماج کو بدلنے اور طبقاتی سماج کی جگہ غیر طبقاتی سماج قائم کرنے سے ہی یہاں کے محنت کش طبقے میں محبت اور اُنس کے جذبات پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ ایسا غیر طبقاتی سماج قائم کرنے کے لیے انقلابی افکار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قبیلوں، برادریوں، مذاہب اور روایاتی خطوط پر چلنے والے طبقاتی مخلوط سماج میں ایسے نظریات کی اشاعت انتہائی مشکل کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان جیسے طبقاتی مخلوط سماج میں انقلاب صرف اقتدار کی تبدیلی کا نام ہے، معاشی یا ثقافتی تبدیلی کا نہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ لوگوں تک مارکس کی تعلیمات آسان فہم انداز میں پہنچائی جائیں اور ان میں استحصالی قوتوں کے خاتمے اور اپنے بنیادی حقوق اور اظہار رائے کی آزادی کا شعور اجاگر کیا جائے۔ عام طور پر مذہب ایسی انقلابی سوچ کی مزاحمت کرتا ہے لیکن خوش قسمتی سے ہم ایسے مذہب کے ماننے والے ہیں جو ترقی پسند مذہب ہے۔ ترقی پسند سوچ رکھنے والے علمائے دین کی مدد سے لوگوں کو ان کی پسماندگی اور استحصال کا احساس دلایا جاسکتا ہے۔ اسلام کا دیا معاشی نظام انہی بنیادوں پر استوار ہے جن کی تعلیم سوشلزم دیتا ہے۔ اسلام معاشی مساوات کا قائل، تقسیم کے اصول پر عمل پیرا اور پسینہ سوکھنے سے پہلے اُجرت کی ادائیگی کا درس دیتا ہے۔ اسلام سوشلزم سے قطعی متصادم نہیں اور اسی لیے ڈاکٹر خیال نے کئی ایک قرآنی آیات سے اپنے خیالات کی تائید حاصل کی ہے۔

اس کتاب کا ایک اہم باب ''مارکسزم پر اعتراضات اور ان کے جواب'' ہے۔ کارل مارکس بنیادی طور پر فلسفہ تاریخ کا طالب علم تھا، لیکن اس نے عام لوگوں کی زندگی کا جائزہ لیا اور انہیں معاشی اعتبار سے طبقاتی نظام کے مظالم کا شکار پایا۔ تب اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''داس کیپٹا'' کی صورت میں ایک نیا معاشی نظام دیا، اس کی مخالفت اس کے اپنے عہد میں بھی ہوئی اور آج بھی سرمایہ داری نظام کے حامی اسے اپنے اعتراضات کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ یوں تو پوری کتاب ہی ڈاکٹر خیال کے تبحر علمی اور جودتِ ذکر کی عکاس ہے لیکن اس باب میں انہوں نے کارل مارکس اور اس کے فلسفے پر اعتراض کرنے والوں کے جوابات تفصیل سے دے کر مارکس کا کامیاب دفاع کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر رفیع الدین اپنی کتاب ''مارکسیت کا مغالطہ'' میں اعتراض کرتے ہیں کہ مارکس کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کے حقیقی تصور کو ہی بدل دیتا ہے اور ڈاکٹر خیال کا کہنا ہے کہ مارکس انسانی فطرت کے حقیقی تصور کو نہیں بدلتا بلکہ اس تصوریت کو بدلتا ہے جو فطرت کی حتمی حقیقت کا شعور ہی نہیں رکھتی۔ وہ تو بڑے واضح انداز میں کہتا ہے کہ جیسا نظامِ معیشت ہوگا ویسی ہی اقدار، اخلاقیات، روحانی مزاج، سائنس، فلسفہ اور آرٹس وغیرہ ہوں گے۔ نظام اچھا ہوگا تو اخلاقی اقدار بھی اچھی ہوں گی بُرا ہوگا تو پھر یہاں اچھائی کی توقع رکھنا عبث ہے، نیز یہ تبدیلیاں تاریخی رفتار کے ساتھ ساتھ آئیں گی۔

کتاب کے دیگر اہم موضوعات میں قانون و انصاف اشتراکی نقطہ نظر سے، کچھ دیر مغربی اشتراکی مفکرین کے ساتھ، سوشلزم اور فرد کی حیثیت وغیرہ شامل ہیں۔ ابتداء میں ظہیر کاشمیری مرحوم کا مختصر اور مشتاق احمد کا سیر حاصل تبصرہ بھی لائق توجہ ہے۔

''سوشلزم اور عصری تقاضے'' میں ہی ''سوشلسٹ آگہی'' کے نام سے مصنف کی ایک اور کتاب ''نئی سوچ'' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا تفصیلی تعارف بھی مشتاق احمد کا تحریر کردہ ہے۔ اس کتاب کے مضامین کا بنیادی موضوع بھی سوشلزم ہے، خیال امروہوی چونکہ اپنی ہر بات کی تائید اسلامی اور قرآنی تعلیمات سے حاصل

کرتے ہیں اس لیے یہ کہیے کہ وہ اسلامی سوشلزم کے حامی ہیں اور اپنی اس تصنیف میں بھی وہ اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ کبھی جاگیرداری نظام اور کبھی آمریت کی چکی میں پسنے والے پاکستانی عوام کی تمام تر مشکلات کا حل صرف ایک ایسے نظام میں پوشیدہ ہے جو اسلام اور سوشلزم کی بنیادی تعلیمات کے عین مطابق ہو، جہاں ذرائع پیداوار کسی فردِ واحد کی نہیں اجتماع کی ملکیت ہوں اور جہاں محنت کش کو احساس بیگانگی کے عذاب سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

اس حصۂ کتاب میں انہوں نے اقبال کی فکر کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اقبال بھی مارکسزم کی طرح استحصالی قوتوں کے خلاف جنگ کے قائل ہیں لیکن اقبال نے اشتراکیت کو غیر روحانی نظامِ معیشت قرار دیا تھا جب کہ سرمایہ دارانہ نظام کی شدید مخالفت کی تھی، جس کی بہترین مثال اقبال کی نظم ''خضرِ راہ'' ہے۔

مختصر یہ کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر خیال امروہوی نے فکر و خیال کی کئی ایک راہیں کھولی ہیں اور آپ ان سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں اور اتفاق بھی۔ وہ پاکستانی طبقاتی مخلوط سماج کے لیے فوری انقلاب اور ایک متوازن اقتصادی نظام کے خواہاں ہیں۔ ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں اور انہیں اپنا کام یہ سوچے بنا جاری رکھنا ہے کہ وہ دُور افتادگی کی وجہ سے صحیح پروجیکشن پانے میں ناکام رہے ہیں، کم از کم یہ احساسِ محرومی ایک ترقی پسند دانشور کی مثبت سوچ سے لگا نہیں کھاتا۔

۳۔ گوشے اور جالے / احمد صغیر صدیقی

احمد صغیر صدیقی ہمہ جہت تخلیق کار ہیں، وہ شاعر، ادیب، مترجم، نقاد، کالم نگار اور نامعلوم کیا کیا ہیں۔ ان کی تحریریں ملک بھر کے اہم اخبار و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انہی تحریروں میں سے بیشتر کو انہوں نے اپنی کتاب ''گوشے اور جالے'' میں ادبی/تنقیدی مضامین، ادبی فکاہیے اور ادبی کالم کی عنوان سے شائع کیا ہے۔ خود کو بنیادی طور پر شاعر قرار دینے والے صغیر صدیقی کے ادبی/تنقیدی مضامین بیشتر شاعری خصوصاً جدید شاعری ہی کے حوالے سے تحریر کیے گئے ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر ان کے زیادہ تر مضامین شاعری کا ''محشر نامہ'' ہی ہیں۔ کیونکہ انہیں اکثر یہی گلہ ہے کہ پاکستان میں بڑے شاعر اور بڑے شعر کو پرکھنے والی آنکھ کم ہے جبکہ ایسے ادیبوں شاعروں اور ناقدین کی بھرمار ہے جو صرف PR یا ادبی گروہ بندی کے سبب پھل پھول رہے ہیں، لہٰذا اکثر معاملہ ''حاجی'' سے شروع ہوتا ہے اور ''ملا'' پر ختم ہو جاتا ہے۔

ان کے اپنے کہنے کے مطابق چونکہ ان پر اکثر یہ اعتراض ہو چکا ہے کہ پھر وہ بڑی شاعری اور حقیقی شاعر کسے قرار دیتے ہیں؛ تو اس کے جواب میں ان کا خوبصورت مضمون ''شاعری'' شاملِ کتاب ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ اس میں ان کی اپنی رائے کم اور دنیا کے بڑے مفکرین کی آرا زیادہ شامل کی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر واقعی اسی معیار پر جدید شاعری کو پرکھا جائے تو کھرے کھوٹے کا نتارا بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان کی تنقیدی نگاہ بہت گہری بھی ہے اور تیز بھی__ ''منفرد'' کہنے سے اس لیے گریز کیا کہ خود ان کے اپنے کہنے کے مطابق اس طرح کے لاحقے لگا کر تحریریں بھاری بھرکم بنائی جاتی ہیں۔ خیر اسی تنقیدی نگاہ نے اور ان کے شاعرانہ ذوق نے چند ایک ہی سہی لیکن بہترین شعری مثالوں کا لطف اٹھانے کا موقع دیا ہے__ اور ہمیں ان کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ بڑی شاعری میں واقعی ''لازمانیت ہوتی ہے اور وہ جس

دور میں تخلیق کی جاتی ہے اس میں اس سے بہت آگے جانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔'' اس کی شاندار مثال اردو شاعری میں غالبؔ کی ہے (اس مثال پر یقیناً صغیر صدیقی کو بھی اعتراض نہ ہوگا) ایک بات البتہ سمجھ میں نہیں آئی کہ مضامین میں انہوں نے ظفر اقبال کو بحیثیت شاعر قطعی بودا ثابت کیا ہے جبکہ اسی کتاب کے آخری صفحات پر اپنے انٹرویو میں وہ ظفر اقبال کو منفرد شعراء میں شمار کرتے ہیں۔

''ادبی فکا ہیے'' معلوم ہوتا ہے ناصر بغدادی کی خیریت دریافت کرنے کے لیے تحریر کیے گئے ہیں۔ ناصر بغدادی سے ان کی چشمک معاصرانہ کی وجوہات میرا خیال ہے کہ خالصتاً ''ذاتی'' ہیں کیونکہ جس طرح ناصر بغدادی نے بہت سے بڑے ناموں کو اپنے رسالے بادبان کے اداریے میں لتاڑا ہے۔ احمد صغیر صاحب ادب کے اس انداز کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ''تعریف کی دولتیاں چلوانا'' ایسے محاورے خود انہیں بھی معیوب نہیں لگتے ___ یہ عجیب تضاد ہے۔

''ادبی کالم'' ان کی ''تیکھی اور انوکھی کالم نگاری'' (بقول انور سدید) کے نمونے ہیں۔ صغیر صاحب کا قلم تقریباً ہر موضوع پر ہی تیکھا ہے اور یہ تیکھا پن تب زہر میں بجھا تیر بن جاتا ہے جب وہ نام نہاد یا اپنے تئیں عظیم شعرا اور ادبا کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے ناقدین چونکہ لان جائی نس کی تعلیمات کے مطابق ہر ادب پارے میں ترفع تلاش کرنے کے بعد اسے ارفع قرار دے دیتے ہیں اس لیے صغیر صاحب کے طنز کا نشانہ بننے والوں میں کئی ایک ناقدین بھی شامل ہیں۔ اکثر تکلف سے کام لیتے ہوئے وہ اپنے ہدف کے نام تحریر نہیں کرتے، لیکن جملوں کا اندازِ نشست تعارف کا فرض انجام دے دیتا ہے۔

چونکہ ان کی ذاتی خواہش ہے کہ انہیں ان کی غلطیوں سے آگاہ اور اچھی تجاویز سے نوازا جائے۔ اس لیے وہ دوسروں کی اصلاح کا کارِ خیر خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ ان سے ایک بات البتہ ضرور کہنی ہے اور وہ یہ کہ اس کتاب میں شامل تحریروں میں تکرار کا سقم پیدا ہو گیا ہے۔ بار بار ایک ہی بات پڑھنے کو ملے تو تحریر بے لطف بھی ہو جاتی ہے۔

۴۔ ملتان میں جدید اُردو نظم کی روایت / شازیہ عنبرین

Mario Puzzo کے ناول "God Father" نے مافیا کی اصطلاح سے روشناس کرایا تو یہ بھی سمجھایا کہ مافیا کا سرغنہ جہاں دوسروں کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتا ہے، وہیں اطالوی روایات کے مطابق اپنے خاندان اور ساتھیوں کے لیے شجر سایہ دار ہوتا ہے۔ مجھے یہ بڑے بڑے شہر لاہور، کراچی، پنڈی وغیرہ ''ادبی گاڈ فادرز'' لگتے ہیں۔ اپنے اپنے ادبی خاندانوں اور انجمنوں کے لیے تو شجر سایہ دار اور ہمارے جیسوں کے ہاں کیسے ہی لعل و گوہر چھپے ہوں کوئی خبر ہی نہیں۔ قدامت، تاریخی حوالے اور جغرافیائی اعتبار سے ملتان بھی کچھ کم اہم تو نہیں ہے لیکن اس بے چارے کے گرد آموں کی پیٹیاں سجا کر گرد، گور، گرما کا نعرۂ مستانہ لگا دیا جاتا ہے اور بس۔ اس کی باقی تمام خوبیاں نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ شاید اسی لیے زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبۂ اُردو نے ایسے تحقیقی مقالوں کو منظر عام پر لانے کا بیڑہ اُٹھایا ہے جو اس شعبے سے وابستہ طالب علموں نے ایم۔فل یا پی۔ایچ۔ڈی کے سلسلے میں تحریر کیے۔ ڈاکٹر انوار احمد اُردو ادب کا ایک بڑا نام ہیں۔ وہ معروف نقاد، افسانہ نگار اور محقق ہونے کے ساتھ شاندار اور بے

مثال اُستاد بھی ہیں۔ ان کی تنقیدی نگاہ جس تحقیقی مقالے پر پڑتی ہے، زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آجاتا ہے۔ انہی میں سے ایک تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل، ''ملتان میں جدید اُردو نظم کی روایت'' ہے جسے شازیہ عنبرین رانا نے ڈاکٹر روبینہ ترین، چیئرپرسن شعبہ اُردو، زکریا یونیورسٹی ملتان کی زیرِ نگرانی مکمل کیا اور اب یہ مقالہ شعبے نے کتابی شکل میں طبع کرا کے ادبی حلقوں کے حضور تنقید و تبصرہ کے لیے پیش کر دیا ہے۔ شازیہ عنبرین آج کل شعبہ سے بحیثیت ریسرچ سکالر وابستہ ہیں۔

یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول جدید اُردو نظم کے مفہوم اور پس منظر کو واضح کرتا ہے۔ فاضل محققہ نے جدیدیت کی تعریف کے بعد اُردو نظم کی روایت بیان کی ہے اور تقریباً ایسے تمام شعراء کا مختصر تذکرہ کیا ہے جو اُردو نظم کی روایت کو مضبوطی عطا کرتے ہیں۔ باب دوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ الف: ملتان میں اُردو شاعری کی روایت اور ب: ملتان میں جدید اُردو نظم کے فروغ کے منابع۔ جب کہ باب سوم ملتان کے جدید نظم گو شعراء کا فرداً فرداً تعارف ہے۔ ۲۹ شعراء پر مشتمل یہ فہرست مکمل نہیں کہی جا سکتی اور یقیناً شازیہ عنبرین کو کئی شاعروں کے ''گلے'' بھی ملے ہوں گے۔ باب چہارم میں جدید اُردو نظم کی روایت کے تناظر میں ملتان کے جدید نظم گو شعراء کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور راجہ نیاز، اسد ملتانی، عرش صدیقی، اسلم انصاری، انوار انجم، عبدالرشید وغیرہ کو اقبال، فیض، راشد، مجید امجد، میراجی وغیرہ کی روایت کا تسلسل قرار دیا گیا ہے۔

یہ مقالہ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے عصری تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور محقق اور نگران دونوں کی تنقیدی و تحقیقی بہترین صلاحیتوں کا عکاس ہے۔ کوئی تحقیق اس وقت تک معیاری نہیں کہلاتی جب تک تحقیق کرنے والا سخت محنت، گہرے مطالعے اور مکمل چھان پھٹک کے کٹھن مرحلے اور تجربے سے نہ گزرے۔ شازیہ عنبرین رانا نے تحقیق کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے اس مقالے کو مکمل کیا ہے۔

اس مقالے کا دوسرا باب اہم ہے۔ یہ صرف ملتان میں اُردو شاعری کی روایت یہی بیان نہیں کرتا، اس کی قدامت سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ بزرگوں اور صوفیوں کی یہ سرزمین بقول مرزا ابنِ حنیف ۲۵۰۰ ق۔م سے کئی صدیوں کی رل ترل اپنی دھڑکنوں میں سموئے ہوئے ہے۔ ادبی حوالوں سے بھی اس کا دامن ویدوں، اشلوکوں، گیتوں اور کافیوں سے بھرا ہوا ہے۔ تقسیم سے قبل کے ملتانی شعرا کا کلام اس عہد کے معروف جرائد و رسائل میں طبع ہوتا رہا اور یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ ان میں وہ بزرگ شعراء بھی شامل ہیں جو کلاسیکی روایت کے پاسبان تھے اور وہ بھی جو نئی نسل کے نمائندہ شاعر کہلائے اور انہوں نے جدید نظم کی روایت کو اپنایا۔

اس باب کا دوسرا حصہ جو جدید اردو نظم کے منابع کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں شازیہ عنبرین نے تحریر کیا ہے کہ مغربی تحریکوں اور جدید رجحانات نے جس انداز سے اُردو ادب کی دیگر اصناف اور ان کے لکھنے والوں کو متاثر کیا اسی طرح ملتان کے نظم گو بھی ان عالمی تبدیلیوں اور رجحانات کا اثر قبول کرتے رہے لیکن انہوں نے اپنی مخصوص لے اور انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے روایت کی بھی مکمل پاس داری کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جدید اردو نظم نے جو لہجے اپنائے اور جو ہیئتی اور لسانی تجربے کیے۔ ملتان کے شعرا نے اس اعتبار سے بھی اُردو نظم کو مایوس نہیں کیا۔

اسی حصے میں ملتان کے ان اداروں کی تفصیل بھی درج ہے جو تخلیق کاروں کی نرسری ثابت ہوئے۔ ان میں ایک بڑا نام اُردو اکادمی کا ہے۔ شازیہ عنبرین نے اس اکادمی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کی ادبی

خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ ایک اور محقق کے حوالے سے ملتان کی ایسی کئی ایک ادبی انجمنوں کی فہرست دی ہے جو مختلف ادوار میں خدمات سرانجام دیتی رہیں۔ان ادبی انجمنوں نے ملتان میں شعروادب کے فروغ کے لیے نمایاں کردار انجام دیا۔

بحیثیت مجموعی یہ ایک عمدہ تحقیقی مقالہ ہے اور اُردو ادب خصوصاً ملتان میں نظم کی تاریخ کے باب میں اک گراں قدر اضافہ۔ملتان کے معروف شعراء نے جدید اُردو نظم کی روایت کو توانا بنانے میں جو کامیاب سعی کی اُسے عصر حاضر یا مستقبل کا کوئی ناقد یقیناً نظر انداز نہیں کرسکتا۔

۵۔ آفاق /تدوین: قیوم طاہر

پطرس بخاری نے لاہور کا جغرافیہ لکھا تو لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ سازی قرار دی اگر وہ آج پاکستان کا جغرافیہ تحریر کرتے تو انہیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی کہ صرف لاہور ہی کی نہیں پاکستان بھر کی سب سے بڑی صنعت یہی رسالہ سازی ہے۔ ہر شہر سے کھمبیوں کی طرح سر نکالتے رسائل و جرائد کے ہجوم میں اپنی شناخت بنانا اور پھر اپنے معیار کو قائم بھی رکھنا کارِدارد ہے اور اگر کبھی اس سوئمبر میں کسی، کے گلے میں ورمالا ڈالنے کی نوبت آ جائے تو یہی سخت جانی چناؤ کو آسان بنا دیتی ہے۔اس تمہید کا سبب دراصل قیوم طاہر کا تدوین کیا رسالہ ''آفاق'' ہے جس کی جنم بھومی راولپنڈی کینٹ ہے۔آفاق کا چوتھا شمارہ سالنامہ میرے سامنے ہے۔آفاق سے یہ میری دوسری ملاقات ہے__یاد رہے__ آفاق مجھے قیوم طاہر نے نہیں بھیجا بلکہ سید عامر سہیل مرتب ''انگارے'' کی وساطت سے ملا ہے۔کبھی کبھی پہلا تاثر بڑا جاندار ہوتا ہے اور یہاں اپنے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے۔ بظاہر آفاق دوسرے پرچوں ہی کی طرح ہے__بظاہر کچھ بھی ایسا انوکھا نہیں__ لیکن ایک چیز ہوتی ہے لہجہ__اور اس پرچے کا لہجہ بڑا کٹیلا ہے__ بلکہ بڑا ہی بے لاگ__ جبھی تو گزشتہ پرچے میں انور سدید کی احمد فراز کے خاکے پر دی رائے کو ایڈٹ نہ کیا گیا__ لہجہ تو بڑا تیکھا ہے محمد حمید شاہد کا بھی__ جو آفاق پر چھائے ہوئے ہیں۔چاہیں تو آپ انہیں آفاق کا Musketeer بھی قرار دے سکتے ہیں۔افسانہ، تنقید، تبصرہ، سبھی پر ان کا قلم کٹار کی طرح چلتا ہے، پہاڑی دریاؤں کی طرح شور مچاتے گزرتے چلے جاتے ہیں اور یوں آفاق کے کریڈٹ میں یہ خوبی ڈال جاتے ہیں کہ آفاق اردو تنقید کو ایک نیا لب ولہجہ دے رہا ہے جو ہماری روایتی تنقید سے بہت مختلف ہے۔!

آفاق کے اس سالنامے میں ہر مزاج کے قارئین کے لیے اپنے اپنے ذوق کے مطابق سبھی کچھ ہے، نظم ونثر کی تقریباً ہر صنف آپ کی ادبی تشنگی کو سیراب کرنے کے لیے حسبِ توفیق موجود ہے۔اب تک تو ''نثری نظم'' کا عنوان دیکھنے کو ملتا رہا__ آفاق نے اسے ''نثم'' کا نام دیا ہے۔دیکھئے اب اس کی پیروی کون کرتا ہے اور کون اسے نشانۂ اعتراض بناتا ہے۔بہرحال آفاق کی یہی خوبی کیا کم ہے کہ اس میں بھرتی کی چیزیں بہت کم ہیں وگرنہ سالنامے کے نام پر ریوڑیوں کی بانٹ کا رواج تو بڑا پرانا ہے۔آفاق اپنی تخلیقاتی پیش کش کے اعتبار سے معاصر ادب کا نمائندہ پرچہ ہے، بظاہر کسی ادبی گروپ یا کسی مخصوص نظریئے کا ترجمان نہیں لیکن کچھ ناموں سے اس کی وابستگی اس کے ادبی جھکاؤ کی عکاس ضرور ہے۔

چلتے چلتے آخری بات__ آفاق کا اداریہ ''پہلا دریچہ'' کے عنوان سے ہے۔موضوع اردو زبان ہے جسے پہلی خبر کے مطابق صوبہ سرحد کی حکومت نے سرکاری زبان قرار دیا ہے۔اور دوسری اہم خبر یہ ہے کہ آڈیٹر جنرل

پاکستان نے بھی اردو کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کر دیا ہے۔یہ ساری خبریں بڑی خوش آئند ہیں۔لیکن ایک خبر ہمارے پاس بھی ہے اور شاید ادبی حلقوں کے لیے اس میں دل چسپی کا کوئی پہلو نکل آئے اور وہ یہ کہ علامہ اقبال شاعر کو نئی نسل کی برادری سے تین پتھر باہر کرنے کے لیے پہلا قدم یوں اٹھایا گیا ہے کہ میٹرک کے اردو کے نئے نصاب میں میرؔ بھی ہے، غالبؔ بھی اور حالیؔ بھی لیکن اقبالؔ نہیں__ (البتہ پہلی بار وزیر اعلیٰ پنجاب کا پیغام طالب علموں کے نام شاملِ نصاب ہے)__ تو کہیں اقبال بھی ''واحد عالمی استعمار'' کی جارحیت کا ہی تو شکار نہیں ہوگیا؟

۶۔ اگر تم لوٹنا چاہو / ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

دس غزلیں

(غلام حسین ساجدؔ)

نخلِ فردا کو اگرچہ بے ثمر رکھا گیا ہے
کچھ خیال اب باغِ ہستی کا مگر رکھا گیا ہے

میری آنکھوں میں چھپا ہے خواب اک اجلے بدن کا
اور نہاں اُسی آئنے میں اک شرر رکھا گیا ہے

خاک اُڑائی ہے بہت میں نے یہاں پچھلے جنم میں
اِسی نگر کا نام میرے نام پر رکھا گیا ہے

مل رہے گا ایک دن شاید مجھے وہ کم سخن بھی
لوگ کہتے ہیں کہ چاہت میں اثر رکھا گیا ہے

کر نہیں پایا ہوں یک جا میں کبھی اپنے بدن کو
میری مٹی کو ازل سے دربدر رکھا گیا ہے

ڈھالتا رہتا ہوں لفظوں میں نشاطِ آرزو کو
میرے حصے میں یہی کارِ ہُنر رکھا گیا ہے

کس لیے آوارہ پھرتا ہوں میں ان گلیوں میں ساجدؔ
جب مری قسمت میں صحرا کا سفر رکھا گیا ہے

گرہ پڑنے لگی ہے کس لیے زنجیرِ وحشت میں
اُلجھ کر رہ گیا ہوگا کوئی دامِ محبت میں

ابھی تو سانس لینے کی بھی فرصت مل نہیں پاتی
گزاریں گے کبھی دو چار دن اس کی رفاقت میں

جدا ہوتا نہیں ہے خواب گر یہ میری آنکھوں سے
مزہ آنے لگا ہے کیا اِسے اب میری صحبت میں

میں گھر سے تو چلا تھا کوچۂ دلدار کی جانب
نکل آیا ہوں صحرا کی طرف کس خوابِ وحشت میں

اسیرِ خواب آیندہ رکھوں کیوں اپنی آنکھوں کو
نہیں ہے فرق اگر کچھ بھی متاعِ رنج و راحت میں

بھروسا تو ہے اپنے زورِ بازو پر مجھے، لیکن
خبر کیا اُس نے کیا کچھ لکھ دیا ہے مری قسمت میں

عجب اسرار کھلتے جا رہے ہیں رات دن ہم پر
بہت کم وقت باقی رہ گیا ہے اب قیامت میں

مجھے خوش آ گئی ہے اب ادائے دلبری ساجدؔ
کہ چپکے سے اضافہ ہو رہا ہے اُس کی چاہت میں

غلام حسین ساجدؔ

طائرِ غیب بن کر ہوا ہو گیا ، کب کسی کے وہ زیرِ نگیں آ سکا
رنگ جو آسماں پر بکھر نہ سکا ، خواب جو اِس زمیں پر نہیں آ سکا

آئنہ ، آسماں ، آبِ آیندہ سے رابطہ اُس پری زاد کا ہے اگر
ہو رہے گی اُسے خود بخود یہ خبر ، میں کسی رنگ میں گر کہیں آ سکا

عکس و معکوس کے پھول کھلنے تو دو ، غیب کی نعمتوں سے حذر مت کرو
جاگ اُٹھے گا دیوار پر آئنہ ، طاق پر جب گلِ یاسمیں آ سکا

کھل اُٹھیں گی چراغوں کی بے کل لویں ، ناچ اُٹھیں گے آزردہ پھولوں کے دل
ٹوٹ کر تب گرے گا یہ شہرِ الم ، لوٹ کر جب مرا ہم نشیں آ سکا

جمع کرتا ہوں کس شوق سے آج بھی دہر میں جڑ پکڑتی ہوئی روشنی
کوئی صحرا جو چرخِ رواں پر رُکا ، کوئی دریا جو زیرِ زمیں آ سکا

بے نشاں منزلوں کے تعاقب میں ہم عمر بھر ساتھ چلتے رہے ہیں ، مگر
کیا مجھے اعتبار اُس کی باتوں پہ تھا ، کیا اُسے میرے سچ پر یقیں آ سکا

ڈھل چکا ہے وہ مہرِ جلال شہی یا ضرورت نہیں اب ستم کی رہی
ایک مدت کے بعد آج دربار میں دیکھتا ہوں کوئی نکتہ چیں آ سکا

نعمتوں سے بھری قاب کے روبرو منتظر ہوں کسی لمحۂ شوق کا
مجھ سے بہتر وہ درویش ہے یا اخی ، جس کے حصے میں نانِ جویں آ سکا

غلام حسین ساجدؔ

گل کھلاتی ہوئی راحتِ غیب کے رنگ میں ڈھل رہا تھا وہ میری طرح
کیا کہوں کچھ دنوں سے عدو کو مرے کس قدر کھل رہا تھا وہ میری طرح

بڑھ رہا تھا بہت اُس کا دیوانہ پن ، سرخ پڑتا چلا جا رہا تھا بدن
روح میں جڑ پکڑتے ہوئے ہجر کی آگ میں جل رہا تھا وہ میری طرح

اُس کے راحت کدے سے جُڑے باغ میں جھانکنے کی مجھے جب اجازت ملی
بے خبر ، اپنے نعلین اُتارے ہوئے ، نیند میں چل رہا تھا وہ میری طرح

میں نے پوچھا تو کہنے لگا ''سرخ ہیں بے محابا مسرت سے آنکھیں مری''
کیا کسی کو بتائے کہ کیوں رات بھر بے سکوں کل رہا تھا وہ میری طرح

بار پاتی نہ تھی جس کے دل میں خوشی ، خوش نہ آتی تھی جس کو کسی کی ہنسی
ہو گیا تخت سے آج محروم کیا ، ہاتھ کیوں مل رہا تھا وہ میری طرح

جانتا ہوں نہیں ہے وہ نجمِ سحر ، ہے سحر سے اُسے کوئی نسبت مگر
دھیرے دھیرے افق کے جھروکے میں پھر صبح دم ڈھل رہا تھا وہ میری طرح

غلام حسین ساجدؔ

ورائے عز و شرف نیند میں چلا جائے
کسی چمن کی طرف نیند میں چلا جائے

پلٹ کے آئیں گے اپنی کمان میں اک دن
ابھی تو سوئے ہدف نیند میں چلا جائے

عطا ہوئی ہے اگر فرصتِ نشاط ہمیں
بہ فیضِ طرز سلف نیند میں چلا جائے

یہ دھیان آتا ہے اک شوخ کے تعاقب میں
گلی میں تیغ بکف نیند میں چلا جائے

بہت رہے ہیں خود اپنے ہی خوف سے ہشیار
کبھی تو مثلِ صدف نیند میں چلا جائے

کسی پری کو لیے اپنے رخش پر ساجدؔ
کبھی تو سوئے نجف نیند میں چلا جائے

کس طرح کوئی کلی دل میں مرے کھل پاتی
مدحتِ رزق سے فرصت ہی نہیں مل پاتی

بارِ احساں نہ اُٹھاتے کسی غارت گر کا
کوئی دیوار اگر خود سے کبھی ہِل پاتی

سوزنِ عمر رواں ہار گئی آخرِ کار!
تارِ گریہ سے مری جیب نہیں سل پاتی

بائیں رخسار کو چھو لیتے اگر ہونٹ مرے
دائیں رخسار پہ وہ بھید بھرا تِل پاتی

آنکھ بھر کر میں اُسے دیکھ ہی لیتا ساجدؔ
کاش تنہائی میں کچھ دیر کو وہ مل پاتی

غلام حسین ساجدؔ

چراغِ نینواؔ ہے یا کوئی مردنگ کابل کا
طلسمی آئنے پر عکس پڑتا ہے یہ کس گل کا

کشید فرح کرتا ہوں سوادِ خواب گریہ سے
چہکنا یاد کرتا ہوں کبھی تصویر بلبل کا

مجھے اُڑ کر پہنچنا ہے کنارِ آبِ حیواں تک
کہو اِس پل سے کتنا فاصلہ ہے دوسرے پل کا

میسر آ نہیں سکتا کہیں بھی اب سکوں مجھ کو
کہ ہنگامہ فلک پر بھی ہے خلقِ شہر کے غُل کا

ابھی پہچان سکتا ہوں میں غیروں اور اپنوں کو
ابھی چھوٹا نہیں ہے ہاتھ سے دامن تحمل کا

بدل پائی نہیں طرزِ سخن کیا اِس گلستاں کی!
مرے حصے میں آیا ہے وہی شیوہ تغزل کا

نہیں چل پاؤں گا اِس قافلے کے ساتھ میں ساجدؔ
کہ باقی ہے ابھی تک روح پر سایہ تساہل کا

طوق و زنجیر سے آزاد نہیں ہو سکتیں
اِن دنوں بستیاں آباد نہیں ہو سکتیں

کتنی یادیں ہیں بھلانے کے لیے پاس مرے
یاد کرتا ہوں مگر یاد نہیں ہو سکتیں

سروقد پھرتی ہیں دن رات گلی کوچوں میں
پر وہ تجھ سی بتِ شمشاد نہیں ہو سکتیں

بستیاں لاکھ کرے چشمِ تخیل ایجاد
غیرتِ بصرہ و بغداد نہیں ہو سکتیں

ایسی آنکھیں جو کسی شوخ کو خوش آتی ہوں
یوں رہینِ شبِ فریاد نہیں ہو سکتیں

جی میں آتا ہے کسی روز اُسے کہہ دیکھوں
ایسی باتیں جو مرے بعد نہیں ہو سکتیں

ناچتی ہیں جو مرے خون کی لَے پر ساجدؔ
لڑکیاں ہوں گی ، پری زاد نہیں ہو سکتیں

غلام حسین ساجدؔ

نام و نسب کی داخلی تنصیب کے بغیر
اے کاش کوئی شہر ہو تخریب کے بغیر

آ کر کھلا ہے کوچۂ دلدار میں یہ بھید
مشکل ہے کارِ عشق بھی ترغیب کے بغیر

مڈبھیڑ ہو گئی جو کبھی اُس پری کے ساتھ
میں کیا سکھاؤں گا اُسے تہذیب کے بغیر

اپنی خوشی سے جاگتی سوتی ہیں خواہشیں
آباد ہے یہ گھر کسی ترتیب کے بغیر

کچھ بھی نیا نہیں یہاں معمول کے سوا
کیا آ سکے گا وہ کسی تقریب کے بغیر

میں کچھ نہیں ہوں ایسے قصیدے سے مختلف
بے کیف رہ گیا ہو جو تشبیب کے بغیر

ساجدؔ میں کیوں نہ فخر کروں اپنے آپ پر
تسلیم ہو چکا ہوں میں تکذیب کے بغیر

ساجدؔ رکھے گا کام فقط اپنے کام سے
میں لاکھ سر کھپاؤں مگر اُس کے سامنے

کم پڑ رہے ہیں شام و سحر اُس کے سامنے
ظاہر ہیں میرے عیب و ہنر اُس کے سامنے

کرتا رہے وہ لاکھ گریز اپنی ذات سے
اُٹھتی نہیں ہے میری نظر اُس کے سامنے

کیوں مجھ کو داغِ سجدہ کی تہمت نہیں قبول
خم ہو رہا ہے آج بھی سر اُس کے سامنے

بچھتے چلے گئے تھے شجر اُس کی راہ میں
بے دم پڑے تھے برگ و ثمر اُس کے سامنے

ہوتا نہیں بیان مرے دل کا ماجرا!
میں کیا کہوں گا بارِ دگر اُس کے سامنے

احساس تک نہیں جسے میرے وجود کا
کیا لے کے جاؤں دیدۂ تر اُس کے سامنے؟

افسردہ لگ رہی تھی فضا کس لئے مجھے
خاموش کیوں تھے شمس و قمر اُس کے سامنے

حروفِ زر (قارئین کے خطوط)

''انگارے'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ شمارے میں مضامین بھر پور اور قابل مطالعہ ہیں، بالخصوص ''علم الاصوات'' از اصغر علی شاہ، ''راشد کی میت سوزی کی وصیت'' از شوکت نعیم قادری، ''ادب ادیب اور قاری'' از احمد صغیر صدیقی پسند آئے۔ عارف ثاقب کا خاکہ لطیف الزماں خاں نے بڑے تعلقِ خاطر سے تحریر کیا ہے، خاں صاحب یقیناً صاحبِ اسلوب ادیب ہیں۔ حصہ شاعری بھی نہایت معیاری ہے۔

(سجاد مرزا۔ گوجرانوالہ)

ملتان سے انگارے کی اشاعت یقیناً ایک اہم ادبی واقعہ ہے۔ آپ نے عبداللہ حسین پر کمزور نمبر شائع کرنے کا کفارہ خلیل صدیقی نمبر کی شکل میں ادا کیا ہے۔ خلیل صاحب پر یہ نمبر اہلِ ملتان کی اُن سے (مارچ میں ان کی برسی پر) محبت کا ایک خوبصورت حوالہ ہے۔ کیا یہ سلسلہ ہر سال مارچ میں تسلسل کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ میری ایک اور تجویز بھی ہے کہ ابنِ حنیف صاحب، سید سبطِ حسن اور ان لوگوں پر بھی اس طرح کے خاص نمبر شائع کریں جن کی تخلیقات ''انگارے'' میں شائع ہوئی تھیں اور آج سے ستر اسی سال قبل ہندوستان کی ادبی فضا کو گرمیِ تخلیق عطا کی تھی۔ ''انگارے'' کی چوتھی اشاعت میں جناب شوکت نعیم قادری کا دردانگیز بلکہ رقت انگیز مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے راشد کی عدم تفہیم یا پھر دوسرے الفاظ میں عوام الناس میں مقبولیت نہ ہونے کا سبب اُن کی میت سوزی کی وصیت کو قرار دیا ہے اور اس مضمون کے دوسرے حصے میں راشد کی اس وصیت کو بھی شک کی نظر سے دیکھا ہے اُن کا خیال ہے کہ راشد کی میت سوزی کی وجہ سے اُردو شعر و ادب کا قاری اپنے خاص مذہبی پسِ منظر کی وجہ سے ان سے دُور ہوتا چلا گیا ہے۔

> ''اب یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا راشد اور قارئین راشد کے درمیان موجود بُعد یا ابعاد کے ضمن میں صرف اور صرف ان کی مشکل پسندی ہی آڑے آتی ہے؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے پس منظر میں ایک اور اہم وجہ بھی کارفرما ہے اور وہ ہے راشد کی میت سوزی کی وصیت۔''
> (انگارے۔۴، ص ۳۵)

یہ وہی بات ہے جو ''گمان کا ممکن'' پر مضمون لکھتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے کی تھی۔ انہوں نے جو خیال راشد کے آخری مجموعے کی اُردو دنیا میں پذیرائی نہ ہونے کے حوالے سے ظاہر کیا تھا شوکت نعیم قادری صاحب نے وہی بات راشد کی پوری شاعری پر منطبق کر دی ہے۔

> ''آخر اس مجموعے سے اس قسم کا سلوک کیوں روا رکھا گیا ہے اور اس کی طرف مناسب طرز پر توجہ کیوں نہ دی گئی! یہ سوالات فوری طور پر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کیا اس کی ایک وجہ یہ تو نہیں ہے کہ راشد نے

> میت سوزی کی وصیت کی تھی؟ بظاہر اس بات میں حقیقت نظر آتی ہے کہ ان کی میت سوزی کی خبر سن کر اُردو دنیا ایک مذہبی اور تہذیبی رویے سے دوچار ہوئی تھی اور ادب کے نقادوں نے اس موقع پر دکھ اور افسوس کا اظہار کیا تھا۔'' (لا = راشد، ص ۲۰۷)

اس مضمون میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے جیلانی کامران کے مضمون کا بھی حوالہ دیا ہے جنہوں نے راشد کی میت سوزی کے حوالے سے ایک متوازن مضمون تحریر کیا تھا لیکن یہ صورتحال تو راشد کی میت سوزی کے بعد کی ہے، کیا راشد کی زندگی میں ہمارے ناقدین نے راشد کی طرف توجہ دی تھی۔ جس شعری مرتبے پر وہ فائز تھے کیا اُردو کے ناقدین کی توجہ وہ حاصل کر سکے تھے۔ خود ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا ایک خوبصورت مضمون اس حوالہ سے اسی کتاب (لا = راشد) میں موجود ہے۔ دراصل راشد نے جس زمانے میں شعر گوئی شروع کی وہ بڑا عجیب زمانہ تھا، ایک طرف اختر شیرانی کے نغمات کی گونج موجود تھی تو دوسری طرف اقبال کے شعری افکار اُردو دنیا کے باسیوں کو اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرصت نہیں دے رہے تھے۔ پھر راشد نے اپنی فکر کو جس شعری پیراہن میں بیان کیا اس کے خلاف بھی رجعت پسندی کی حد تک مزاحمت موجود تھی۔ راشد کے زمانے کے اکثر ناقدین یا تو اس شعری تجربے کی تفہیم سے عاری تھے یا اپنے مخصوص کلاسیکی مزاج اور غزل پرستی میں اس قدر راسخ تھے کہ اس نئی آواز کو سمجھنے کی کوشش کو فضول امر گردانتے تھے۔ سو اگر ہم بیسویں صدی کی چوتھی، پانچویں اور چھٹی دہائی کی تنقید کو اُٹھا کر دیکھیں تو وہ صرف آزاد نظم کو یہ بتانے میں مصروف ہے کہ وہ اپنے مصرعوں کو برابر اور متوازن کیسے کر سکتی ہے۔ راشد پر تنقید کی سب سے بڑی عبرت ناک مثال شاید نہیں یقیناً حیات اللہ انصاری کی ہے۔ پھر ترقی پسند تحریک (یہاں پر ترقی پسند تحریک کہا گیا ہے ترقی پسندی نہیں۔ بلاشبہ راشد ایک ایسے ترقی پسند شاعر تھے جو اس تحریک کا تو حصہ نہیں تھے لیکن ان کے شعری تجربات میں تاریخ، تہذیب، سیاست اور اقتصادیات کو بے حد اہمیت حاصل ہے) سے راشد کی شعوری دوری اور خود ترقی پسندوں کا ردِعمل کے طور پر راشد کو ایک رجعت پسند شاعر قرار دینا بھی راشد کی عدم تفہیم کا ایک سبب ہے۔

راشد کی نظموں میں جس انسان کی تصویر کشی ملتی ہے وہ ایک پیچیدہ انسانی صورتحال میں موجود ہے۔ راشد کوئی زاہد خشک نہیں کہ شرما کر وہ اس انسان کی جنسی زندگی کو اس سے منہا کر کے دکھائے۔ وہ کسی ماورائی عشق کا قائل نہیں ہے بلکہ جنس اس کے نزدیک محبت کی لطافت کو بڑھانے والا عمل ہے اس لیے وہ اس پر نہ تو شرماتا ہے اور نہ ہی غزل کے شاعر کی طرح (غزل کی صنفی مجبوریوں کی وجہ سے) رمز و ایما سے کام لیتا ہے۔ ہمارے مخصوص تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی پس منظر کی وجہ سے راشد اس لیے بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھے جا سکے کہ وہ جنس کا بیان واضح انداز میں کرتے ہیں۔ الغرض راشد کے مقبول نہ ہونے یا پھر اُردو دنیا میں اس کی عدم تفہیم کے کئی اسباب ہیں لیکن سب سے بڑا سبب وہی ہے کہ وہ اپنے وضع کردہ خاص تخلیقی معیار سے نیچے نہیں اُترے۔ وہ اپنی تخلیقی عظمت کو مقبولیت کے شمشان گھاٹ پر قربان کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ ایک بڑے شاعر ہیں اور آنے والی صدیوں میں بھی ایک بڑے شاعر کے طور پر زندہ رہیں گے۔ اُن کی مشکل پسندی ہمیں غالب کی یاد دلاتی ہے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر آفتاب احمد نے انہیں شاعروں کا شاعر قرار دیا ہے۔

قادری صاحب کے مضمون کا دوسرا حصہ تحقیق کے حوالے سے اور زیادہ کمزور ہے۔ رسمیات تحقیق

میں یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ قیاس کو کمزور ترین شہادت پر بھی فوقیت حاصل نہیں ہے، وہ رسمیاتِ تحقیق کی اس خو سے بخوبی آشنا ہوں گے لیکن شاید وہ راشد کے حوالے سے زیادہ جذباتی ہو گئے۔ شیلا اور شہریار نے راشد کی وصیت کے حوالے سے جو کچھ بیان کیا اور لکھا ہے اُسے محض قیاس کی بنیاد پر رَد کرنا تحقیق کے حوالہ سے نادرست ہے۔ یہ محض ایک مفروضہ ہے کہ شیلا اور شہریار جس نفرت کی آگ میں جل رہے تھے اس میں انہوں نے راشد کی میت بھی جلادی۔ ساقی فاروقی کے مبہم بیان کو بنیاد بنا کر اتنا بڑا نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ شیلا اور شہریار نے ایک من گھڑت وصیت کے ذریعے راشد کی میت سوزی کا سامان پیدا کیا۔ خود شہریار کے الفاظ ہیں:

> ''راشد صاحب نے اپنی لاش کو جلانے کی جو وصیت کی تھی اس پر عمل درآمد کے فیصلے میں ساقی فاروقی صاحب پوری طرح شامل تھے۔ ہر مرحلہ میں وہ ہمارے ساتھ تھے بلکہ وہ تو آگے بڑھ بڑھ کر ہماری حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ بعد میں جوانہوں نے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش کی تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے اس اقدام کے خلاف کچھ ردعمل ہوا اور ساقی فاروقی صاحب نے سوچا کہ اس سے اپنا دامن بچالینے ہی میں عافیت ہے۔'' (ن م راشد، شخص اور شاعر، ص ۲۱)

قادری صاحب، راشد، شہریار اور شیلا کے تعلقات کے حوالے سے اپنے قیاس کو جو استنادی ثبوت مہیا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ''ہم سفر'' سے حمیدہ اختر حسین کا ایک طویل اقتباس ہے۔ اگر قادری صاحب اس اقتباس کو غور سے پڑھ لیتے تو شاید اسے اپنے مضمون میں شامل نہ کرتے۔ حمیدہ اختر حسین نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری برسوں میں تحریر کی جب ان کا حافظہ اکثر مقامات پر ان کا ساتھ دینے سے قاصر رہا۔ انہیں تو راشد کی دوسری بیوی کا نام تک یاد نہیں۔ وہ اس پورے طویل اقتباس میں شیلا کو ہیلن کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ انہوں نے ہیلن یا شیلا کا ذکر ایک ایسی روایتی بوڑھی مشرقی عورت کا روپ دھار کے کیا ہے جو مغرب کی عورت کو اپنے مخصوص تعصّبات کی نظر سے دیکھ رہی ہو۔ جب حمیدہ اختر حسین کا حافظہ اس قدر ضعف کا شکار ہے کہ انہیں شیلا کا نام تک بھول جاتا ہے تو پھر ان کی دیگر باتوں پر کس طرح کوئی محقق یقین کر سکتا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ پھر آخر ہیلن کون تھی۔ یہ ایک امریکن خاتون تھیں جن سے راشد کے شدید تعلقِ خاطر کا ذکر ساقی فاروقی نے اپنے مضمون ''حسن کوزہ گر'' میں کیا ہے۔

راشد ایک آزاد خیال شاعر تھے وہ اس قدر مذہبی طرزِ احساس کے حامل نہیں تھے جس قدر قادری صاحب نے ڈاکٹر فخر الحق نوری کی آڑ لے کر انہیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح ایلیٹ کی شاعرانہ عظمت پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ وہ ایک کٹر مذہبی آدمی تھے، اسی طرح سے راشد کی شاعرانہ عظمت ان کی میت سوزی کے واقعے کی بنیاد پر مجروح نہیں ہو سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ قادری صاحب اپنے سے ماقبل ناقدین کے تسلسل کے اس ذہنی تحفظ کے اسیر ہیں کہ عظیم شاعر یا بڑا شاعر مقبول بھی ہوتا ہے۔ اگر ایک عظیم یا بڑا شاعر مقبول بھی ہو تو یہ تاریخ ادب کا ایک نادر الوجود واقعہ ہوتا ہے لیکن عدم مقبولیت کسی تخلیق کار کی فنی عظمت کو گہنا نہیں سکتی۔

قادری صاحب کو چاہیے کہ وہ راشد کی میت سوزی یا لفظ خرافات کی بحث جیسے پیش پا افتادہ

موضوعات کو چھوڑ کر کسی اور طرف توجہ دیں کیونکہ تحقیق کی دنیا میں تو بقولِ اقبال

آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

(ڈاکٹر قاضی عابد۔ ملتان)

''انگارے'' کی چوتھی کتاب موصول ہوئی۔ اس بار کا ٹائیٹل سادگی کے باوجود دلکش تھا۔ موجودہ شمارے میں ''علم الاصوات'' کے حوالے سے اصغر علی شاہ کا مضمون جامع اور بھرپور ہے جبکہ احمد صغیر صدیقی نے ایک مشکل موضوع کو بڑے احسن طریقے اور سلیقے سے نبھایا ہے۔ شوکت نعیم قادری نے بظاہر ایک غیر اہم موضوع پر اچھا مضمون لکھا ہے، نعیم صاحب کی راشد صاحب سے محبت اس مضمون کے ہر لفظ سے چھلکتی ہے۔ ایرک فرام کے حوالے سے خالد سعید کا مضمون بھرپور ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ایرک فرام کے نفسیاتی اصولوں کی تشریح کی گئی ہے وہ بہت عمدہ اور قابل داد ہے۔ بزم سخن میں قیوم طاہر، احمد رضوان اور افضل گوہر کی غزلیں پسند آئیں۔ قیوم طاہر اور افضل گوہر بھرپور شاعری کر رہے ہیں ان کی غزلوں میں تہہ داری کا عنصر روز بروز گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

(فہیم شناس کاظمی)

رسید و اطلاع:

ڈاکٹر یوسف خشک (خیر پور میرس)، غلام حسین ساجد (لاہور)، ڈاکٹر علمدار حسین بخاری (سرگودھا)، ڈاکٹر عارف ثاقب (لاہور)، سلیم شہزاد (بہاول نگر)، ناصر حسین بخاری (اسلام آباد)، ضیا اللہ کھوکھر (گوجرانوالہ)، ناصر عباس نیر (جھنگ)، رعنا اقبال (کراچی)، خیال امروہوی (لیہ) ظریف احسن (کراچی)، خالد محمود سنجرانی (لاہور)

❋ ❋ ❋